افسانے

خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے

احمد ندیم قاسمی

www.HollaGulla.com
Virtual Home
for Real People

بہت پیارے

گلزار

کے نام

جو فلمی ہدایت کاری، گیت

نگاری اور مکالمہ نویسی میں غیر

فانی شہرت رکھنے کے علاوہ ایک

بڑے افسانہ نگار بھی ہیں

فہرست

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر
1	چوری	4
2	پاؤں کا کانٹا	9
3	قلی	14
4	اسلام علیکم	22
5	سرخ ٹوپی	28

چوری

دن بھر تھانیدار کے لئے جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے بعد غریب منگو گلی کے ایک نکڑ پر دیوار سے پیٹھ لگا کر سستانے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نظریں اپنے پاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ ایڑیوں میں داڑیں سی پڑ گئی تھیں اور انگلیوں سے خون پھوٹ کر ناخنوں کے کنارے پر جم گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ اس کو اپنے گھر آٹا گوندھنے جانا تھا۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور وہ ابھی تک کنوارہ تھا۔ ایک جگہ ایک بزرگ کے زریعے کچھ بات چیت کی تھی۔ لیکن لڑکی والے پانچ سو روپے طلب کرتے تھے۔ اور اسے پیٹ بھرنے کے لئے پانچ پیسے بھی مشکل سے میسّر آتے تھے۔ خاموش ہو رہا۔ اس نے سوچا۔ ویسے بھی گزر ہو ہی جائے گی۔ یہی سمجھ لوں گا کہ شادی کرتے ہی بیوی مر گئی اور میں رنڈوا ہو گیا۔ پھر بھی کبھی کبھی جب کوئی عورت سر پر گاگریں رکھے۔ اٹھلاتی ہوئی، سینہ تانے اسے کنکھیوں سے دیکھ کر گزر جاتی یا دور کسی مکان کی چھت پر کسی دھوپ سینکتی دوشیزہ کی نظریں اس کی نظروں سے لڑ جاتیں تو وہ اپنی زندگی میں بہت بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔ لیکن، جلد ہی پیٹ کے دھندوں میں پھنس کر وہ اس تکلیف دہ احساس سے چھٹکارہ حاصل کر لیتا۔

اس نے دو قدم اٹھائے۔ اچانک گاؤں سے باہر دور ایک گولا چھوٹنے کی آواز آئی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں بھی اب صاف سنائی دینے لگیں۔ ’’کسی کی بارات آ رہی ہے!‘‘ اس نے کہا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف جانے لگا۔ اور پھر کنوارے اور رنڈوے تو براتیں دیکھنے کے دلداہ ہوتے ہیں!

اس سے ایک شخص نے پوچھا۔ ’’کدھر منگو خیر تو ہے؟‘‘

’’خیر ہے بھائی! بس اِدھر ڈُھول کی آواز آئی۔ میں نے کہا۔ چلو رونق میلا ہی دیکھ لیں۔ کس کی بارات ہے آج؟‘‘

’’کیا کرو گے پوچھ کر۔۔۔۔ جھوٹی براتیں!‘‘

’’جھوٹی براتیں؟‘‘ منگو نے متعجب ہو کر پوچھا۔

’’ہاں جھوٹی براتیں۔۔۔۔ سچی برات تو ہو گی جس میں تم سہرا باندھ کر گھوڑے پر سوار ہو گے۔!‘‘

منگو جھینپ گیا! اور وہ شخص ہنستا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

دور سے اسے بے شمار مشعلیں نظر آئیں۔ جن میں بار بار کالے کالے ہاتھ کالی کالی صراحیوں سے تیل ڈالتے تھے۔ آگے آگے علاقے کے مشہور میراثی تھے۔ دو ڈھول جن سے ریشم اور موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ دو شہنائیاں جن کے بندوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ ایک بین باجا جس کی بے شمار تو تیوں سے لٹکتے ہوئے سنہری پھندے جھم جھم کر رہے تھے۔ میراثیوں کے پیچھے سوار تھے جن کے شملے موروں کی دُموں سے بھی کچھ زیادہ پھیلے ہوئے تھے اور جن کی مونچھیں آسمانوں کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

کئی سوار اپنی مریل مریل گھوڑوں کی پسلیوں میں ایڑیاں گھسیڑ گھسیڑ کر انہیں ناچنے یا کم از کم اپنی گردنیں اٹھانے پر مجبور کر رہے تھے، جو نفرت انگیز انداز میں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ کئی سوار اپنی خوبصورت بنی ٹھنی گھوڑیوں کو نچانے کی کوشش میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکتے تھے اور چیخ کے اِرد گرد کے لوگوں سے امداد کے طالب ہوتے تھے۔ اِن کے پیچھے چار اُونٹ تھے۔ جن کے ماتھوں پر، گھٹنوں پر،

گردنوں، سینوں پر، موٹے موٹے گھنگھروں کی مالائیں باندھی ہوئی تھیں اور جن پر لدے ہوئے کجاووں میں کئی لڑکیاں بیٹھی تھیں جو اپنے آپ سے شرماتی اور لاج سے سکڑی جاتی تھیں۔ ان کے گال تمتمائے ہوئے تھے اور ان کے کانوں میں لٹکتے ہوئے بندے جھمر جھمر کر رہے تھے۔ ہوا میں لہراتی ہوئی اوڑھنیوں کو سنبھالنے کی کوشش میں کئی بار اُڑتی ہوئی پریاں معلوم ہوتی تھیں جو اپنے ارضی محبوب سے مل کر واپس ستاروں کی طرف جا رہی ہوں۔ کئی ایسی بھی تھیں جو اپنا شباب گزر جانے پر بھی اس طرح اکڑی بیٹھی تھیں جیسے سارے مجمع کی نظر صرف ان پر پڑ رہی ہیں جبکہ ان کی طرف صرف ادھیڑ عمر کے رنڈوے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہونٹ لال کر رکھے تھے اور بے شمار زیوروں کے بوجھ سے کجاووں میں جھک جھک جاتی تھیں۔ ان سب کے پیچھے پیدل چلنے والے تھے جن کے سرسراتے ہوئے لباسوں سے عطر کی لپیٹیں آ رہی تھیں۔ فوجی سپاہیوں کا سب سے بڑا تحفہ عطر ہی تو ہے جس سے وہ لڑکیوں پر اپنا رعب جما سکتے ہیں۔

منگوں بھاگا بھاگا آیا اور دو تین لجاتی لڑکیوں کو گھورتا اور ماتھے سے پسینہ پونچھتا پیدل چلنے والوں میں شامل ہو گیا۔ جب گولے چھوٹتے تھے اور گھوڑے بدکتے تھے تو برات میں نئی زندگی دوڑ جاتی تھی۔ جب شہنائی والے سر کو پیچھے لے جا کر شہنائیوں کا منہ آسمانوں کی طرف کرتے تھے اور ایک لمبی تان کھینچتے تھے اور ادھر سے پھلجھڑیاں تیر کی طرح آسمانوں پر جا کر نیلے، پیلے، سرخ اور سبز شراروں کی شکل میں اپنے پیچھے لکیریں چھوڑتی ہوئی واپس لپکتی تھیں تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے موسیقی کے جادو سے آسمان کے تارے کھچ کھچ کر شہنائیوں میں سما جانے کے لئے اُڑے آ رہے ہیں۔

راجپوت کا چہرہ خوشی کی وجہ سے تمتما اُٹھا تھا۔

برات گاؤں میں داخل ہوئی۔ لوگ چھتوں پر چڑھ کر سجی ہوئی اور بنی ٹھنی لڑکیوں کو دیکھنے لگے۔ منگو کے جی میں آئی کہ چلو دُولہا تو دیکھیں۔ آخر وہ خوش قسمت کون ہے جو ہمارے گاؤں کی لمبے لمبے بالوں اور گلابی گلابی رخساروں والی الھڑ لڑکی کو لینے آیا ہے۔ وہ تو نظر ہی نہیں آ رہا۔ وہ پیدلوں کے مجمع کو چیر کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ شور مچ گیا۔ ”میرا بٹوہ! میرا بٹوہ چوری ہو گیا“۔۔۔۔ اور اچانک بے شمار ہاتھ منگو کے کاندھے پر پڑے ”کدھر بھاگا جا رہا ہے، بدمعاش، بدذات“

منگو نے مڑ کر دیکھا۔ تیل اور گھی سے چمکتے ہوئے چہروں پر لال آنکھیں ابلی پڑتی تھیں۔ برات رک گئی اور سارے مجمع نے منگو کو گھیر لیا۔

تمام برات پر پہلے تو ایک لمحہ کے لئے خاموشی چھائی رہی۔ پھر اِرد گرد سے سرگوشیوں کی سرسراہٹ اٹھی اور اس کے بعد ایک شخص نے بڑھ کر منگو کو بالوں سے پکڑ لیا۔ منگو نے ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ اس شخص کو کیسے جرأت ہوئی کہ اس نے ایک غیر گاؤں کے نوجوان کو یوں بالوں سے پکڑ لیا ہے۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں غریب آدمی ہوں اور مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کو دیکھا جس میں اس کی چوڑی چھاتی کے بال نظر آ رہے تھے ۔۔۔ اس پر تمام اسرار منکشف ہو گئے۔

اس شخص نے کڑک کر پوچھا۔ ”کدھر ہے بٹوا ؟ کدھر ہے بٹوا کُتے کے بچے!“

منگو کا خون کھول کر آنکھوں کے ڈوروں میں آ گیا۔ اِسے یہ خیال نہ رہا کہ ایک غریب انسان تمام برات سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بازوؤں کے پٹھے پھڑکنے لگے۔ اس نے گھونسا تان کر اس شخص کے جبڑوں میں جما دینا چاہا مگر سامنے ایک گھوڑی پر اسے گاؤں کا سردار نظر آیا۔ خیالات برقی سرعت سے اس کے دماغ کی شریانوں میں گردش کرنے لگے۔ ''مجھے اپنے شہر کے سردار کے آگے فریاد کرنی چاہیے۔ میں نے کئی بار چوپال پر اس کے پاؤں دبائے ہیں۔ اس کے گھر کے لئے لکڑیاں کاٹ لایا ہوں۔ اس کے کاموں پر دن میں تیس تیس کوس پیدل سفر کیا ہے۔ یہ غیر گاؤں والے میری بےعزّتی کر رہے ہیں۔ تو اس میں سارے گاؤں کی بےعزّتی ہے۔ میں نے بٹوا چرایا ہے تو میرے پاس موجود ہونا چاہیئے۔'' ۔۔۔ اس نے وہیں سے چیخنا شروع کر دیا۔ ''ملک جی آپ کا اقبال بڑھے مجھے ان بدمعاشوں نے گھیر لیا ہے'' ۔۔۔ اب اس کے بالوں پر سے مضبوط ہاتھ علیحدہ ہو چکا تھا ۔۔۔ ''ملک جی۔ مجھ پر یہ ناحق الزام دھر رہے ہیں۔ ملک جی آپ بہت خوب جانتے ہیں۔ میں نے آج تک چوری نہیں کی۔ میں غریب ہوں مگر اپنی حلال کمائی سے پیٹ بھرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں۔ سارا گاؤں جانتا ہے۔ خدا جانتا ہے۔''

اس نے اپنی آنکھیں بیحد اشتیاق سے سردار کے چہرے پر گاڑھ رکھی تھیں۔ وہ منتظر تھا کہ ابھی سردار کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلے گا، برات والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے اور وہ فخر سے اکڑتا ہوا اپنے گھر آ کر آٹا گوندھنے لگے گا۔

لیکن سردار کی للکار اس پر بجلی بن کر گری۔ ''بدمعاش، جیب کترے، حرامزدے تجھے شرم نہیں آتی ؟ گھر آنے والوں کی یوں خاطر کی جاتی ہے؟ سارے گاؤں کی ناک کاٹ کر رکھ دی۔ کدھر ہے بٹوا؟ نکال اسے، نکال۔'' اب اس کی پیٹھ پر سردار کا پتلا چابک شڑاپ شڑاپ پڑ رہا تھا۔ ''نکال ورنہ تیری مشکیں کس کر اور الٹا لٹکا کر مرچوں کا دھواں دوں گا، مرچوں کا۔''

''حضور۔ مجھے خدا کی قسم، مجھے قرآن کی قسم، مجھے۔''

''بٹوا نکال، کہاں رکھا ہے، کس جھاڑی میں پھینکا ہے؟ کدھر ہے بٹوا؟ کدھر ہے بٹوا؟'' ۔۔۔ اور ہر جملے پر اس کی پیٹھ پر ایک ایسا چابک پڑتا تھا کہ اس جلد سر سے لے کر پاؤں تک طنبورے کے تاروں کی طرح لرز کر رہ جاتی تھی۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ایک نہیں سنی جائے گی۔ خدا اور قرآن ان کی نظروں میں کھلونے ہیں۔ ان پر قسمیں کوئی اثر نہیں کریں گی۔ جس بوڑھے کا بٹوا گم تھا وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ ''دس روپوں کے سات نوٹ۔ دس روپوں کے سات نوٹ۔ دس کم اسی روپے! لوگو! میں لُٹ گیا۔ میں نے اس شخص کو تیزی سے بھاگتے دیکھا تھا۔ یہی میرا چور ہے۔'' بوڑھے کی زبان تیزی سے چل رہی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ کے قطرے اُڑ اُڑ کر اس کی گنجان داڑھی میں چمک رہے تھے۔

سردار کے حکم سے برات آگے بڑھنے لگی اور منگو کو گاؤں کے دو چوکیداروں کے حوالے کر دیا گیا جو اسے چوپال پر لے آئے۔ کچھ دیر بعد سارا گاؤں اور سب بارات والے چوپال پر آ موجود ہوئے۔ اندھیری رات تھی اور ایک نائی کے ہاتھوں میں ایک مشتعل جل رہی تھی۔ تھانے سے ایک حوالدار اور ایک سپاہی بھی بلائے گئے۔

منگو زمین پر بیٹھا ایک تنکے سے مٹی کرید رہا تھا اور سوچ رہا تھا ''جس کمبخت نے بٹوا چرایا ہے وہ مجھ پر رحم کھا کر بٹوا چوپال کے وسط میں کیوں نہیں پھینک دیتا؟

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

غریبوں پر لوگ ترس کیوں نہیں کرتے؟ سب میری مُصیبت پر مسکرا کیوں رہے ہیں؟ عجیب بات ہے! عجیب قانون ہے! عجیب سمجھ ہے؟''

وہ اٹھ کر حوالدار کے سامنے آ گیا۔ ''حوالدار جی۔ میں آپ کے آگے سچی سچی بات کہہ دوں گا۔ آپ کو یقین آ جائے تو خیر۔ نہیں تو آپ کی مرضی کے آگے میرا کوئی بس نہیں۔ سارا گاؤں مجھے خوب جانتا ہے۔ بدقسمتی سے برات دیکھنے چلا گیا۔ ایک بار خیال آیا، چلو دُولہا تو دیکھ لوں۔ جانے لگا شور مچ گیا اور سب نے مجھے آن دبوچا۔ میرے تیز قدموں سے انہیں غلطی ہوئی ہے۔ چور ان کا اپنا ساتھی ہو گا۔''

حوالدار جی کی جیب بھاری ہو چکی تھی۔ وہ مسکرا دیئے اور سگریٹ کا دُھواں اپنے چوڑے نتھنوں سے نکالتے ہوئے بولے۔ ''چوری کرنے والے خود بخود اقبال کر لیں تو سرکار کو ہمارے محکمہ کی ضرورت ہی نہ رہے۔ تیری ہتھیلیوں پر گرم گرم انگارے دھرے جائیں گے۔ تیرے سینے پر پتھر کوٹے جائیں گے۔ تجھے ہفتہ ہفتہ بھر بھوکا پیاسا حوالات میں بند رکھا جائے گا۔ تب تو خود بخود پکار اٹھے گا۔ ''حضور بٹوا فلاں جگہ پر پڑا ہے۔'' برخوردار، ہم پولیس والے ہیں!'' اور حوالدار نے اپنی گردن کو کچھ اس طرح ٹیڑھا کیا جیسے وہ زمین و آسمان کو حوالات میں بند کر دینے پر قادر ہے!

منگو نے ایک بار سردار کی طرف دیکھا لیکن اِس کے انداز سے انتہائی بے خبری اور بے توجہی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ ایک زمیندار سے گندم کے بھاؤ کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔

حوالدار کے حکم سے سپاہی نے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک چوّنی نکلی جو اسے لکڑیوں کا گھٹا بیچنے پر ملی تھی۔ چوّنی حوالدار کی جیب میں کھسک گئی اور اسے کہا گیا۔

''جاؤ'' جہاں بٹوا رکھا ہے لے آؤ۔ ورنہ تمہاری کھال اُتار لی جائے گی۔۔۔۔ جاؤ۔''

حوالدار نے اپنی آنکھیں یوں نکالیں جیسے ابھی تڑاخ سے باہر آ پڑیں گی۔ تمام مجمع دم بخود کھڑا تھا۔

'' جاؤ'' حوالدار نے اپنا موٹا ڈنڈا منگو کی گردن پر جماتے ہوئے کہا۔ ''کھڑے کیا تک رہے ہو۔''

''لیکن حضور مجھے کچھ خبر نہیں۔ میں کہاں سے لاؤں۔ میں نے بٹوے کا نام تو سن رکھا ہے مگر ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔ میں غریب آدمی ہوں حضور۔''

''لے آؤ بٹوا۔ جہاں رکھا ہے لے آؤ۔ جسے دیا ہے لے آؤ۔ ورنہ۔ ورنہ۔'' ڈنڈا منگو کی چھاتی پر آن گرا۔

اس نے ایک کونے میں مسجد کے مولوی صاحب کو دیکھا تو پکار کر کہا۔ ''مولوی صاحب! دیکھئے نا۔ میں ۔۔۔''

''مگر بچے چوری بری چیز ہے نا! ''

وہ اپنی تمام نمازوں کو برباد سمجھنے لگا جو اِس نے امام کے پیچھے پڑھی تھیں! اسے حوالدار کا ایک اور دھکا لگا۔ ''لے آؤ بٹوا''

وہ ناچار سر جھکائے چوپال کی سیڑھیوں سے اُترنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک سپاہی اور دو چوکیدار تھے۔ اچانک ایک شخص تیزی سے اِس کے قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔ ''کیوں جی برات والے یہیں ہیں؟''

''ہاں۔ ''منگو نے جواب دیا۔ شائد وہ بھی کوئی براتی تھا۔ کیونکہ اس کا کلف لگا شملہ اوپر بہت دور تک چلا گیا تھا۔

وہ چاپال پر چڑھ گیا اور بولا۔ ''شیر باز۔ بابا شیر باز یہیں موجود ہو گیا؟''

''ہاں ہاں۔ '' شیر باز اٹھا۔۔۔ یہ وہی بوڑھا تھا۔ جس کا بٹوہ کھو گیا تھا!

میں نے راستے میں سنا کہ تم نے ایک بے گناہ پر بٹوے کی چوری کا الزام دھر دیا ہے حالانکہ تم نے مجھے اپنا بٹوا پکڑایا تھا کہ کہیں بھیڑ میں گم نہ ہو جائے۔''

''ارے۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا۔ تمہارے پاس ہے بٹوا؟'' بوڑھے کی باچھیں خوشی کے مارے کانوں کی لوؤں تک پھیل گئی!

منگو کا جسم غصے سے دہکنے لگا۔ چوکیدار اور سپاہی واپس ہو پڑے مگر اس نے وہیں سے کھڑے ہو کر پوچھا۔ ''میں جا سکتا ہوں؟''

منگو گھر آیا تو اسے اپنی چوّنی کا خیال ستانے لگا۔ ''میری دن بھر کی کمائی اس کی جیب میں موجود ہے۔ یہ کہاں کا قانون ہے؟ میں اپنی چوّنی ضرور لوں گا۔'' وہ واپس ہو پڑا۔

چوپال پر پہنچا تو لوگ جا چکے تھے۔ وہ تھانے کی طرف دوڑنے لگا۔ ایک کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ اندر لیمپ جل رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اندر جھانکا تو وہی حوالدار اور سپاہی ایک چارپائی پر بیٹھے شیشے کے گلاس میں کوئی سرخ چیز پی رہے تھے۔

'' حضور'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کون؟'' حوالدار نے پوچھا۔

''حضور میں۔۔۔ منگو۔ ''

''کیا ہے؟ ''

''حضور۔ اس کا بٹوہ مل گیا تھا نا؟''

'' ہاں۔ ''

''پھر حضور۔۔۔ ''

''کیا ؟''

''میری چوّنی مجھے مل جائے؟''

حوالدار اور سپاہی اس زور سے ہنسے کہ حوالات کی سلاخوں سے بھی ایک گونج اٹھنے لگی۔ منگو ان بے معنی قہقہوں پر متعجب ہی ہو رہا تھا کہ کھڑکی کھڑاک سے بند ہو گئی اور درد کی شدت سے وہ اپنی ٹھوڑی اور ناک کو انگلیوں میں دبا کر رہ گیا۔

پاؤں کا کانٹا

پاؤں سے کانٹا نکلاتے ہوئے ننھے کریم کی چیخ نکل گئی۔ وہ ایڑی کو دونوں ہتھیلیوں سے دباتے ہوئے پکارا ''ہائے اماں!'' وہ مبہوت وساکن بیٹھ گیا اور سامنے ویران کھیتوں پر نگاہیں گاڑھ دیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی ماں کی آواز کا منتظر ہوتا ہے۔ میرے انمول لال! میں آئی، میں ابھی کانٹا نکالے دیتی ہوں!''۔۔۔ اس کے سر پر ایک کوّا کائیں کائیں کرتا ہوا گزرا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک جھاڑی میں جا گرا کریم بھول گیا کہ اس کے پاؤں میں کانٹا ہے۔ وہ لنگڑاتا ہو بھاگا۔ کوّے کو پکڑ لیا۔ وہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگا۔ اڑنے کی کوشش کی مگر اس کا داہنا بازو زخمی ہو چکا تھا۔ کریم نے زمین سے مٹی اٹھا کر اس کے زخم پر چھڑکی، دو چار ٹھنڈی سانسیں دیں کوّے کو آرام پہنچا تو کھلی ہوئی چونچ بند کر لی اور آنکھوں میں وحشت کی بجائے اطمینان چھلکنے لگا۔ کریم نے بہت سے پتے اکھٹے کر کے سب سے بڑے نیم کی سب سے اونچی چوٹی پر جمائے۔ کوّے کو ایک دو بار تھپک کر وہاں بٹھا دیا اور گھر کو لوٹ آیا۔ اس مصروفیت میں اس کے پاؤں کے درد میں نمایاں کمی آ گئی تھی۔

وہ ایک کسان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک سال ہوا اس کی ماں مر گئی۔ اس کے والد نے پچھلے دنوں ایک شادی کر لی تھی لیکن اب یہ نئی ماں اس سے عجیب طرح سے پیش آتی تھی۔

''وہ برتن اندر کیوں نہیں رکھا؟''

''وہ پکار اٹھتا۔'' اندر ہی تو پڑا ہے۔''

وہ اس کے جبڑوں میں گھونسا جماتے ہوئے کہتی۔ ''تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

وہ چیخ کر کہتا۔ ''بتایا تو تھا میں نے!!''

کریم نے کئی بار محسوس کیا کہ گھونسے کے زور سے اس کا دل رک گیا ہے لیکن وہ کمبخت اچانک پھر دھڑک اٹھتا اور وہ سہمی ہوئی نظروں سے ایک اور گھونسا سر پر منڈلاتے ہوئے دیکھتا۔ اوّل اوّل تو اس نے سوتیلی ماں کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی۔ ''چھوڑ دے۔ چھوڑ دے مجھے۔ ورنہ میری امّی تیری بوٹیاں نوچ لے گی، چھوڑ دے مجھے ورنہ میرا ابّا تجھے مار ڈالے گا۔'' لیکن ایک دن جب اس کی سوتیلی ماں نے یہ کہا کہ ''تیری ماں کو تو قبر کے سانپ اور بچھو چمٹے پڑے ہوں گے، وہ تیرے باپ کا گھر تباہ کر کے اگلے جہاں میں آرام سے تھوڑا رہے گی!'' تو ننھا کریم غصے سے بے بس ہو کر اس پر جھپٹا مگر دھکا کھا کر اوندھے منہ جا گرا۔ دوڑا دوڑا باپ کے پاس گیا اور چیخنے لگا ''ابّا، خالہ نے میرے دانت توڑ دیئے۔ یہ دیکھو تو مسوڑھوں سے خون بہہ رہا ہے۔ یہ دیکھو نا میری کہنیاں چھل گئیں۔ وہ کہتی ہیں تیری ماں کو سانپ بچّھو کھا رہے ہیں۔ وہ جھوٹ بکتی ہے ابّا۔ میری ماں ہر رات آ کر میرا ماتھا چوم۔۔۔۔''

تڑاخ کی آواز اور پھر کریم کا کان اس کے باپ کی انگلیوں میں تھا۔ کان کو اینٹھتے ہوئے بولا۔ ''خالہ کے خلاف بک رہا ہے۔ اب تیری ماں کا راج نہیں رہا کہ گھر کا غلہ نکال لر دکانداروں کے آگے جا ڈالے اور گلچھڑے اڑائے، اب انسانوں کی طرح رہنا پڑے گا یہاں!''

اس دن کے بعد اس نے باپ کے آگے کوئی شکایت نہ کی، نہ اپنی خالہ کے گھونسوں کا جواب کسی دھمکی سے دیا۔ بس چپ چاپ گھونسے سہ لیتا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی کھاٹ پر بازو کا تکیہ بنا کر سو جاتا۔ صبح گھونسے سہ کر باہر جاتا۔ مویشی چرا کر لاتا اور گھونسے سہ کر سو جاتا۔

اس دن وہ ایک بیل کے پیچھے بھاگا تو اس کی ایڑی میں کوئی بہت لمبا کانٹا چبھ گیا۔ زخمی کوّے کو گھونسلے میں بیٹھا کر گھر آیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی کھاٹ پر لیٹ گیا جو صحن کے پرلے سرے پر بیلوں کے تھانوں کے پاس دن رات پڑی رہتی تھی۔ کھاٹ کیا تھی ایک جھولا تھا۔ جس میں ننھا کریم گھٹنے سینے سے لگائے، بازو جسم سے چمٹائے پڑا رہتا تھا۔

اس کی خالہ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کا باپ پاس ہی ایک پلنگ پر لیٹا حقّہ پی رہا تھا۔ اس کی خالہ کہنے لگی۔ ''ابھی تک کریم نہیں آیا جانے گاؤں میں کیا کرتا رہتا ہے۔ پرسوں کی بات ہے ہمسائی کے ہاں گیا اور کہنے لگا'' مجھے میری نئی ماں مارتی ہے، روٹی نہیں دیتی۔ میں بھوکا ہوں ننگا ہوں۔'' اب اس سے پوچھو میں نے اسے کب مارا۔ میں نے اسے کب کھانا نہیں دیا۔ کب کپڑے نہیں پہنائے۔ اس بچے کو سمجھاؤ، ورنہ یہ گھر گھر کھانے کو مانگتا پھرے گا، اور تم شریکوں کے سامنے سر نہ اٹھا سکو گے۔''

اس تقریر کے دوران میں کریم نے ایک دو بار آواز دی۔ ''میں آ گیا ہوں ابا، میں آ گیا ہوں۔'' لیکن نہ اس کے باپ نے کچھ سنا نہ اس کی خالہ نے۔ جب وہ سانس لینے کے لئے رکی تو کریم ان کے قریب آیا اور بولا: ''میں تو کب کا بیٹھا ہوں خالہ۔''

اس کا باپ حقّہ ایک طرف کر کے اس کی طرف بڑھا۔ ''کیوں بے! تیری ماں کیا مری کہ تو ہر بندھن سے آزاد ہو گیا۔ گھر گھر میرے گِلے ہو رہے ہیں۔'' ایک تھپڑ کریم کے منہ پر پڑا۔ اس کے جی میں آئی کہ باپ کے اس ظلم کے خلاف احتجاج کرے مگر زبان بے حِس ہو کر رہ گئی۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور اپنی کھاٹ کا رُخ کیا۔

''آج لنگڑا کیوں رہا ہے۔'' اس کے باپ نے پوچھا۔

''کانٹا چبھ گیا تھا جی۔'' کریم نے دردناک لہجے میں جواب دیا۔ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز کانپ گئی۔

اس کا باپ گرجنے لگا۔ ''کانٹا چبھ گیا امیر زادے کے۔۔۔ آفت آ گئی۔ اور لنگڑا یوں رہا ہے، جیسے کسی نے پاؤں ہی اڑا دیا ہے۔ ادھر آ، سوئی لے کر دیئے کے پاس بیٹھ جا اور نکال اسے۔''

کریم اندر جا کر سوئی لے آیا۔ دیئے کے پاس بیٹھ کر ایڑی اٹھائی اور سوئی سے کانٹے کے اردگرد کا گوشت کریدنے لگا۔

رہ رہ کر اِسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی جو اِسے ہاتھوں پر اُٹھائے رکھتی تھی۔ جو اِس کے لئے قسم قسم کی چیزیں خرید لاتی تھی۔ کھانے کی چیزیں، پہننے کی چیزیں۔ جس نے اپنی پڑوسن کو ایک دن کریم کے پاؤں سے کانٹا نکال رہی تھی کہا تھا۔ ''اری ذرا دھیرے دھیرے سوئی پھیر۔ بس یہ سمجھ تو میرے کلیجے پر سوئی پھیر رہی ہے!''

کریم کو یہ بات یاد آئی تو اِس کی چیخ نکل گئی۔ اسکا باپ صحن کے پرلے سرے پر بیلوں کے آگے گھاس ڈال رہا تھا۔ اس کی خالہ اٹھی اور اس کے پاس آ کر کہنے لگی۔ ''کیوں بے لونڈے، رو کیوں رہا تھا۔ سانپ نے ڈس لیا ہے کیا؟''

اس نے حسرت بھری نگاہیں اٹھائیں اور خالہ کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ اس کی خالہ نے اس کی گردن پر غصے سے اُلٹا

ہاتھ مارا۔ کریم ڈیوٹ پر جاگرا۔ دیا لڑھک کر اس کی گود میں آ رہا۔ اس کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ لہراتے ہوئے شعلوں سے چیخوں کا ایک طوفان بلند ہوا۔ ''ابّا، دوڑیو، میرے ابّا، میں جل مرا، ہوابّا۔''

اس کا باپ ہوا کی طرح اس کے پاس پہنچا۔ گھڑے پر گھڑا انڈیلنا شروع کر دیا۔ آگ بجھ گئی اور اب زمین پر کیچڑ میں لت پت بیہوش کریم آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ سارا محلّہ اکٹھا ہوگیا۔ لالٹین جلائی گئی۔ کریم کا داہنا بازو، داہنی ران اور داہنی پسلیاں بری طرح جل چکی تھیں۔ کھال اڑ چکی تھی۔ اور نیچے سفید چربی چمک رہی تھی۔ اسے چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ حکیم جی نے زخموں پر مکھن ملنے کو کہا اور اب لوگ چلے گئے!

اب اس کے باپ کا دل پسیجا۔ اسے اپنی بیوی کی مغموم روح سامنے منڈیر پر اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں سنبھالے بیٹھی آنسو گراتی نظر آئی۔ اس کی نگاہیں اپنے جلے ہوئے بیہوش بچے پر گڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے تاروں کی طرف اڑتے وقت ایک سمت اشارہ کیا۔ کریم کا باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب شہر کے باہر بوڑھے نیم کی ٹیڑھی شاخوں کے گھنے سائے میں ان دونوں نے اپنے والدین کی باہمی دشمنی سے بے پروا ہو کر ہمیشہ کے لئے ایک ہونے کا عہد کیا تھا! اس کے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس کا سارا جسم سو گیا۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنے بچے کی طرف بڑھا۔ جس نے اب آنکھیں کھول دی تھیں اور جس کی سوتیلی ماں روٹی پر گھی ڈال کر کھا رہی تھی۔ وہ کریم کے قریب گیا۔ ماتھے پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ ''میرے کریم کہاں کہاں درّد ہے تمہارے؟ تمہارے کہاں کہاں درد ہے؟ بتاؤ نا، مجھے بتاؤ کہ وہاں میں اپنے کلیجے کا خون نچوڑ دوں۔ تم مجھے گھور کیوں رہے ہو، میرے بچے تم مجھے اس طرح نہ دیکھو، میرے ننھے اس طرح تمہارے کمینے باپ کی روح میں نشتر گڑ جاتے ہیں۔ کہاں کہاں درد ہے تمہارے؟ بتاؤ نا''

''ایڑھی پر ابّا۔'' ایک نحیف آواز آئی۔ ''وہاں کانٹا چبھ گیا تھا۔''

کریم کا باپ کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ ابھی تک کریم کو اپنے جلنے کی خبر نہیں تھی۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ ''ابّا یہاں ایڑھی میں اتنا لمبا کانٹا چبھ گیا، خالہ، ذرا سوئی دینا، میں کانٹا نکال لوں۔''

کریم کا باپ شدت درد سے بلبلا اٹھا، ''ہائے میرے بچے، میرے کریم، تم جل گئے ہو، تمہیں معلوم نہیں کیا؟ اللہ تمہیں اچھا کر دے، بہت جلد اچھا کر دے۔ میں اپنے کریم کے لئے اتنی چیزیں لاؤں گا کہ میرا کریم انہیں اٹھا تک نہ سکے گا۔''

کریم کو اب آہستہ آہستہ اپنے جلنے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا باپ اس کی رنگت کی تبدیلی دیکھ کر ہراساں ہوگیا۔ ''اری لانا ذرا، کھانڈ لانا۔ کریم کے منہ میں ڈالوں۔ یہ تو پیلا پڑ رہا ہے۔''

وہ گھی میں لقمہ بھگو کر بولی۔ ''اچھا ہو جائے گا۔ بچے جلتے ہی رہتے ہیں اکثر۔ تم پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ اچھا ہو جائے گا کمبخت تم کیوں اپنی جان ہلکان کرتے ہو۔ ادھر کھانا کھالو، پروٹھے ٹھنڈے ۔۔۔۔ !''

زمیندار کے بھاری جوتے نے اسے آگے بڑھنے کی مہلت نہ دی۔ لقمہ اس کے منہ سے نکل کر فرش پر جا گرا۔ اس کی کھوپڑی تڑاتڑ جوتے کھانے لگی۔ اس نے سارا محلّہ سر پر اٹھا لیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ اسے خاموش کرایا۔ کسان کو ضبط کرنے کی تلقین کی اور چلے گئے۔ کریم

اب چارپائی پر بل کھا رہا تھا گوشت کے ننھے ننھے پرزے آپ سے آپ گر رہے تھے، ساری رات اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا رہا۔

صبح ہوئی تو کریم نے گھٹنے سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ '' ابّا تم مجھے اب مارو گے تو نہیں؟'' زمیندار کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ بہے۔ اس نے انتہائی ضبط سے کہا۔ ''نہیں بیٹا۔'' کریم بولا۔ '' تو ابّا ایک کام کرو۔ گاؤں کی پوربی چراگاہ کے اتری کونے پر نیم کے درختوں کا جھنڈ ہے نا؟ سب سے بڑے نیم کی سب سے اونچی ٹہنی پر ایک کوّے کا گھونسلہ ہے۔ اسے جا کر کچھ پانی اور دانے ڈال آؤ۔ جاؤ گے؟''

''ابھی جاتا ہوں۔'' کریم کے باپ نے جواب دیا۔ لیکن کریم کی ان بے سروپا باتوں کو نیم بیہوشی پر محمول کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کریم نے آنکھیں کھولتے ہوئے پھر کہا۔ ''کیا نہیں جاؤ گے ابّا؟ ''

ابھی جاتا ہوں میرے بچے، کریم یہ کہہ کر اٹھا۔ پانی کے لئے مٹی کا ایک چھوٹا سا پیالہ لیا۔ دانے مٹھی میں ڈال کر گاؤں کی مشرقی چراگاہ کی طرف گیا۔ بڑے نیم کی اونچی ٹہنی پر ایک کوّا گھونسلے سے پر نکالے کائیں کائیں کر رہا تھا۔ وہ اوپر چڑھا کوّے کے پاس پانی رکھ دیا دانے بکھیر دیئے۔ کوّے کو اٹھا کر دیکھا اس کا ایک بازو بری طرح زخمی تھا۔ وہ یہ معمّہ نہ سمجھا اس کا دماغ گھومنے لگا۔ واپس ہوتے وقت ایک شخص نے اسے پوچھا۔ کہاں گئے تھے آپ؟ اس نے جواب دیا۔ ''رات کو۔ رات کو۔ رات کو جلا۔ بس دیئے نے کپڑوں کو آگ لگا دی اور جسم کا دائیاں حصہ گل گیا۔!'' پوچھنے والا شخص متعجب اور شرمندہ ہو کر گلی میں مڑ گیا۔

کریم کا باپ اپنے بیٹے کے پاس آیا۔ جھک کر پوچھا۔ '' جاگ رہے ہو بیٹا؟''

''جاگ رہا ہوں ابّا، کوّے کا کیا حال ہے؟''

''اچھا تھا میرے بچے۔ تمہیں سلام کہتا تھا۔''

کریم نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ''تو میں خود اسے سلام کا جواب دوں گا ابّا۔ اب ذرا بیل کھول دو، باہر جانے کا وقت ہو گیا!''

کسان ضبط نہ کر سکا، بے اختیار رونے لگا۔ اپنی نئی بیاہی ہوئی بیوی کی طرف دیکھا جو ایک کونے میں بیٹھی اسے بے انتہا نفرت سے گھور رہی تھی۔ اسے وہ دن یاد آ گئے۔ جب بیلوں کے لئے ایک علیحدہ ملازم ہوتا تھا اور پھر جب کریم کی ماں چل بسی، تو ملازم کو نکال دیا گیا اور بیل کریم کے آگے لگا دیئے گئے، اسے اپنی ساری زندگی پر اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا دکھائی دینے لگا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ وقتی مسرّتوں کے سیلاب میں اس کی اوّلیں محبت اور خاندانی غیرت کا فولادی قلعہ جڑ سے اکھڑ کر بہہ گیا تھا!

وہ روزانہ صبح و شام کوّے کے لئے دانہ پانی لے جاتا اور پھر کریم کے پاس بیٹھا رہتا کوئی تیماردار آتا اسے کہتا۔ ''بلاناغہ صبح حکیم جی آتے ہیں، دوا لگا جاتے ہیں، لیکن کریم کی حالت گرتی جاتی ہے۔ حکیم جی کہتے ہیں کہ روزانہ کوئی اس کے زخموں کو چھیڑ دیتا ہے۔''

تیماردار کہتا۔ ''کروٹ بدلنے سے کچے زخم چھل جاتے ہوں گے۔ ''

مگر اس کی تسلی نہ ہوتی!

کریم کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی اور آخر ایک دن ایسا آیا کہ کریم صبح کو بیہوش ہوا تو دوپہر تک اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔ اس کا

باپ دیوانوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ بیٹھتا۔ بے مطلب بغیر کسی کام کے۔ اس نے سر کو زانوؤں پر رکھا۔ پیچھے دیوار سے سہارا لے کر بیٹھنا چاہا۔ پاؤں پسار دیئے۔ گھٹنے سکیڑ لئے، لیکن اس کے اندر کا غم اندوہ اور پشیمانیوں کا دوزخ دہک رہا تھا۔ اسے ایک لمحہ بھی سکوں میسّر نہ آسکا، اور اس کی بیوی مکان کے ایک کونے میں بیٹھ کر انگریزی صابن سے ہاتھ منہ اور پاؤں دھوتی رہی۔

دوپہر کو کریم نے آنکھیں کھولیں۔ حکیم جی پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا۔ ’’ملک جی بچہ ہوش میں آ گیا۔ کریم کا باپ دوڑا آیا، کریم کی پیشانی کو اس نے اتنی محبت سے چوما کہ آس پاس کھڑی عورتوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ’’کریم بیٹا، کیا حال ہے اب؟ طبیعت کیسی ہے۔ درد کہاں ہے؟

جواب ملا۔ ’’ایڑی میں ابا، ایڑی میں درد ہے۔ ایک لمبا سا کانٹا چبھ گیا وہاں۔‘‘

آئینہ دیکھتی ہوئی سوتیلی ماں کانپ اٹھی۔ کریم کا باپ بولا۔ ’’بیٹا کل تمہارا کوّا پر تول رہا تھا، مجھے ڈر ہے وہ اُڑ نہ جائے۔‘‘

کریم بولا۔ ’’ تو ابّا! آج آخری بار اسے دانے ضرور ڈال آؤ۔‘‘

حکیم جی نے کہا۔ ’’اب بچے کی حالت اچھی ہے۔‘‘ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کریم کے باپ نے اپنی بیوی کو کریم کی دیکھ بھال کی تاکید کی اور مٹھی میں دانے دبائے کوّے کے گھونسلے کی طرف بھاگا۔

وہ گلیوں میں بگولے کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ چراگاہ میں اس کے پاؤں ہوا میں تھرکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ سورج آسمان کے سینے میں دہک رہا تھا۔ ڈھیروں پر بھیڑیں، بکریاں اور بیل گردنیں جھکائے چر رہے تھے۔۔۔ ساری کائنات اونگھ رہی تھی!

کریم کا باپ تیزی سے بڑے نیم پر چڑھا۔ گھونسلے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ کوّا ’’پُھر ررر‘‘ کی آواز پیدا کرتا گھونسلے سے باہر نکلا اور چراگاہ پر اڑتا، کھیتوں پر سے تیرتا، ڈھیروں پر سے لپکتا ہوا لرزتے ہوئے افق میں غائب ہو گیا۔

اس کے حواس معطل سے ہو گئے۔ وہ ٹہنیوں سے لٹک کر نیچے آ رہا۔ پوری قوت سے گھر کی طرف بھاگا اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ’’بیٹا کریم وہ کوّا تو اڑ گیا!‘‘

کریم کے لبوں پر ہنسی کھیل رہی تھی جیسے وہ اپنے باپ کے جنون کا مضحکہ اُڑا رہا ہے!

حکیم جی آئے۔ انہوں نے کریم کی نبضیں ٹٹول کر کہا۔ ’’آج اس کے زخموں کو کسی نے بہت سختی سے چھیلا ہے، اسی لئے جانبر نہ ہو سکا۔ آپ کے گھر میں کون تھا ملک جی؟‘‘

نئی بیوی کے ہاتھ سے لقمہ گر کر پانی کے برتن میں جا گرا۔

کریم کا باپ کپڑے پھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ ’’لوگو! میرے میرے بچے کی ایڑی میں کانٹا چبھ گیا ہے، اسے نکالو۔ نیم کے درخت میں ایک کوّا رہتا تھا۔ وہ آج پربت سے پرے اڑ گیا۔ اس کو پکڑ لاؤ۔ میری بیوی نے میرے بچے کے زخم چھیل دیئے ان پر پھاہا رکھو۔۔۔ لوگو۔۔۔ لوگو! تم میرا منہ کیا تک رہے ہو!‘‘

قُلی

سرما کی اندھیری راتیں تھیں اور مجھے سارے شہر میں گشت کرنا پڑتی تھی۔ میں پولیس میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا اور ملازمت کے ان ابتدائی ایام میں میری یہ کوشش تھی کہ رات دن کی جان توڑ محنت سے افسروں کی نظروں میں وِقعت حاصل کرلوں اور اپنے مستقبل کو روشن کرنے کی کوئی سبیل ابھی سے ڈھونڈ نکالوں۔ اسی لئے میں راولپنڈی ایسے گنجان شہر کی تنگ گلیوں میں بہت بڑے افسر راتوں کو نکل کر اپنے ماتحت عملہ کی جاں فشانی نہیں دیکھا کرتے کیونکہ وہ شام ہوتے ہی بے شمار مصرفیتوں میں گھر جاتے ہیں۔۔۔ سینما!۔۔۔ شراب!۔۔۔ عورت!

بہرحال روزانہ میں سارے شہر کا چکّر کاٹتا اور آبادی کے آخری سرے پر ایک بوسیدہ سے ہوٹل میں بیٹھ کر ایک آدھ گھنٹہ گزارتا۔ وہاں مجھے گرم چائے کی ایک پیالی بھی مل جاتی۔ مدھم روشنی اور دُھوئیں کی وجہ سے میرے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو سکون سا محسوس ہوتا اور آس پاس بیٹھے ہوئے غریب قلیوں کی باتیں سن کر بڑا سکون حاصل ہوتا!

اس ہوٹل میں اکثر قلی ہی آیا کرتے تھے۔ اسٹیشن نزدیک تھا اور پھر اس ہوٹل میں ایک پیالی چائے ایک پیسہ میں ملتی تھی۔ مزے سے گپیں ہانکو، ہنسو، کھیلو، بینچو پر لیٹو اور ٹین کی کرسیاں بجاؤ اور گاؤ اور جب گاڑی کی گھماں گھم سُنائی دے تو بازوؤں پر پیتل کے بلے باندھ کر بھاگ نکلو!

لوہے کی ایک کرسی جس پر کبوتروں کی خشک بیٹوں سے چھینٹ سی بچھی رہتی تھی!

کمزور سی میز جو ذرا سے مس سے چر چر بولنے لگتی تھی!۔۔۔ اور حقہ جس کی نال پر خدا جانے کتنی مدت کے چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے، میرے منتظر ہوتے۔ میں ہوٹل کے اندر قدم دھرتے ہی یوں محسوس کرتا جیسے بہت لمبے سفر کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا ہوں۔ دھواں اور دو چولھوں کے ساتھ والی دیوار سے لٹکی ہوئی پرانے فیشن کی لالٹین انہیں دیکھ کر میرا سکڑتا ہوا دل پھیل جاتا۔ کونے میں پرانی کرسی پر بیٹھتا کہ کھٹ سے کالی گرم چائے کی ایک پیالی میرے سامنے آ دھمکتی اور میں پشاور کے قریب وجوار کے رہنے والے تندمزاج پروپرائیٹر کا شکریہ ادا کر کے قلیوں کی باتیں سننے میں محو ہو جاتا۔

”اے فضل دین۔ یار تم تو دلّی پار ہو آئے ہو۔ سنا ہے بڑے بڑے ہوٹل ہوتے ہیں اِن شہروں میں۔“

فضل دین سرخ قمیض کی جیب سے چنے نکالتے ہوئے کہتا۔ ”اتنے بڑے بڑے ہوٹل دیکھے ہیں میں نے کہ سارا راولپنڈی شہران میں سما جائے۔ فرش پر دیکھو تو جیسے دریا پر چل پھر رہے ہوں۔ کمروں میں جاؤ تو جیسے جنّت میں داخل ہو گئے۔“

لمبے لمبے پائینچوں کی بھونڈی سی شلوار والا ایک نوجوان کہتا۔ ”وہاں بھی ایک پیالی چائے ایک پیسے میں ملتی ہے“

نہیں بے۔ تو نے کیا انہیں بھنگڑ خانہ سمجھ رکھا ہے۔ چوّنی میں آتی ہے ایک ننھی سی پیالی۔“

”تو ہمارے کس کام کے ہوٹل وہ۔ ہمارے لئے چچا باز خاں کا ہوٹل ہی اچھا ہے۔“

آگرے کا رہنے والا ایک قلی پان کی پیک دیوار پر پھینکتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے بمبئی میں راج محل ہوٹل دیکھا ہے۔ سمندر کے

کنارے پر کھڑا ہے۔ خدا کی قسم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے آسمانوں پر اپنے ہاتھوں سے بناتے رہے اور کسی رات کو چپکے سے اسے زمین پر اتار لائے اور سمندر کے کنارے نصب کر کے اڑ گئے۔‘‘

فضل دین اپنے مدِ مقابل کو دیکھ کر جل اٹھتا اور کہتا۔ ’’اے میر صاحب، تاج محل ہوٹل نہیں مقبرہ ہے اور بمبئی میں نہیں آگرہ میں ہے اور سمندر کے کنارے نہیں، جمنا کے کنارے ہے سمجھے؟‘‘

میر صاحب کچھ کہنا چاہتے مگر قہقہوں کے طوفان سے تنگ آ کر چلّو بھر پیک اگل کر رہ جاتے!

میں انہیں چھیڑنے کے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھتا۔ ’’بھئی سرخ قمیض میں سفید بٹن! یہ کیا مذاق ہے۔‘‘

لمبے لمبے پائینچوں کی شلوار والا نوجوان جواب دیتا۔ ’’سفید بٹن سستے ہوتے ہیں۔‘‘

’’ایک آنے کے چوبیس!‘‘ ایک طرف سے آواز آئی۔

’’لیکن پہلی دھلائی میں ٹوٹ جاتے ہیں کمبخت۔‘‘ ایک دل جلا پکار اٹھتا۔

اس پر ایک بوڑھا قلی واعظانہ انداز میں کہتا۔ ’’بہورانی سے کہو پتھروں پر نہ پٹخا کرے۔‘‘

آہ بھر کر وہی کہتا۔ ’’اے میری بہو تو کب کی مر چکی ہے۔ پڑوس سے۔۔۔۔‘‘

’’پڑوسن سے؟‘‘۔۔۔ سب چیخ کر پوچھتے اور کالے چہرے چیل کی کمزور میزوں پر مارے ہنسی کے جھک جھک جاتے! کئی بار قہقہوں میں یوں گم ہو جاتے کہ بے خبری میں کوئی پیالی فرش پر جا گرتی اور پشاوری پروپرائیٹر کے ہولناک نتھنوں سے اس زور کی تیز تیز سانسیں نکلتیں کہ اس کی بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھرتھرانے لگتیں۔ لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے کہتا۔ ’’چونی کی پیالی کا ستیاناس کر دیا!‘‘

میں سفارش کر دیتا۔ ’’ارے بھئی روز کے گاہک ہیں۔‘‘ اور پشاوری پروپرائیٹر گول پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے سر پر دباتے ہوئے کہتا۔ ’’تھانیدار صاحب کے کہنے پر چھوڑے دیتا ہوں ورنہ شلواریں اتروا لیتا۔‘‘

بڑی دلچسپ محفل رہتی۔ روزانہ گشت کے دوران ہوٹل جانا میرا معمول ہو گیا اور جس روز مجھ سے ناغہ ہو جاتا طبیعت سارا دن پریشان رہتی اور دل پر ایک بے نام سا بوجھ رہتا۔

ایک روز کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی تیز ہوا ہڈیوں سے سرسراتی ہوئی گزر جاتی۔ اندھیری گلیوں میں رینگتے ہوئے لوگ فضا میں تیرتے ہوئے دھبے معلوم ہوتے اور دور گلی کے موڑ کی بتی دھند میں لپٹی ہوئی یوں دکھائی دیتی جیسے مرتے ہوئے انسان کی عرق آلود زرد پیشانی! کائنات پر ہیبت سی چھا رہی تھی۔ فراغت حاصل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ آج کالے رنگ کی گرم چائے کی پیالی بار بار میرے سامنے آ کر منڈلاتی تھی اور میرا کپکپایا ہوا سینہ اور شدّت سے سکڑنے لگتا تھا۔ ہوٹل میں قدم رکھا تو صرف تین قلی ایک طرف بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان میں سے ایک انگلیوں پر کچھ حساب کر کے پھر گھٹنوں میں سر گھسیڑ دیتا اور میری کرسی کے قریب ایک قلی بیڑی کا کش لگا کر بیڑی کے سرے سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لہراتی ہوئی لکیر کو اوپر دھواں دھار خلا میں ضم ہوتا دیکھ رہا تھا!

قریب آ کر میں نے اسے پہچانا۔ وہ لمبے لمبے پائینچوں کی بھونڈی سی شلوار والا قلی تھا۔ اس کا نام محمد دین تھا اور وہ اٹک کے آس پاس

رہنے والا تھا۔ مجھے اکثر اس سے باتیں کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ اگر یہ نوجوان پڑھا لکھا ہوتا تو یقیناً ایک زبردست شاعر ہوتا کہ قومیں اس کے کلام کو الہام تصور کرتیں اور خاک نشینوں کی خوابیدہ روحوں میں انقلاب کے شرارے جھمجھمانے لگتے۔ اس کی باتوں میں دبی دبی آگ سی ہوتی تھی اور باتوں سے فارغ ہو کر ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ میں اسے راولپنڈی کا بہت بڑا تخیل پرست قلی سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا کہ اگر کالی داس، شکسپیئر، ملٹن، تلسی داس، گوئٹے، حافظ، غالب اور اقبال بھی محمد دین کی طرح قلی ہوتے تو انہیں کون پوچھتا۔ وہ بھی دھواں دھار ہوٹلوں میں بیٹھ کر بیڑی کے سرے سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیر کو اوپر اندھیرے میں تحلیل ہوتے دیکھتے اور پیٹھ پر فولادی صندوق اٹھاتے وقت دھیمی لے میں گاتے۔

عزّت دی موت بھلی
بے عزّتی دے جینے کولوں
عزّت دی موت بھلی

محمد دین کچھ پڑھا لکھا ہوتا تو اس کے کلام کو سنہری جلدوں میں سجا کر منقش الماریوں میں رکھا جاتا اور لوگ اس کا نام سنتے ہی فرطِ عقیدت سے جھک جھک جاتے! قدرت نے انسان کو حالات کا غلام پیدا کیا ہے! یہ حقیقت مجھے محمد دین سے مل کر معلوم ہوئی۔

کرسی کو بجتے اور میز کو چرچراتے سن کر وہ چونکا۔ میری طرف دیکھ کر تعظیماً اٹھا اور بولا۔

’’اسلام علیکم تھانیدار جی!‘‘

’’وعلیکم اسلام۔‘‘ میں نے محبت سے جواب دیا۔

وہ یہ کہتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ ’’آپ کا سائیکل بھیگ نہ جائے۔ میں اندر رکھ دوں اسے۔‘‘ سائیکل اٹھا کر اندر لے آیا اور دیوار سے ٹکا کر میری طرف آنے لگا۔

تم نے ناحق تکلیف کی، بھیگا ہوا سائیکل۔۔۔‘‘

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ’’آپ تشریف تو رکھیں۔‘‘

’’آج تمھارے دوسرے ساتھی کدھر گئے۔‘‘

’’گھروں میں دبکے بیٹھے ہوں گے۔ اس موسم میں ان کا باہر نکلنا موت کے منہ میں جانا ہے۔ نہ کمبل نہ چادر۔ ٹھٹھرا کر اکڑ جائیں گے بیچارے تو بھوکی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بچوں کی فوجیں کون سنبھالے؟ کل دگنی محنت کریں گے، کیا کریں!‘‘

میں نے پوچھا ’’تم کیوں چلے آئے؟‘‘

’’سارا دن بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا ہے، ادھر آ نکلا کہ باتوں میں وقت کٹ جائے گا۔ مگر ادھر فضل دین بیٹھا اپنے قرض کا حساب کر رہا ہے اور ہدایت خاں وہ الگ پڑا بھوک کے مارے اونگھ رہا ہے۔‘‘

اچانک محمد دین کرسی پر بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑا ہوا اور پکارا۔ ’’اے خاں جی، چار پیالیوں والی چائے دانی لانا۔‘‘

چائے لائی گئی۔ اس نے پشاوری پروپرائیٹر کے ہاتھ سے چائے دانی لے کر میری میز پر رکھ دی اور بولا ''پیجیئے۔''

میں حیران ہوکر بولا۔ ''یہ کیوں؟''

جیب سے اکنّی نکال کر خاں کی مٹھی میں دباتے ہوئے بولا۔ ''پی لیجیے، کیا حرج ہے! جو شخص میل ڈیڑھ میل تین چار من کا بوجھ پیٹھ پر اٹھائے ہانپتا جائے اور بدلے میں ایک اکنی پائے نزدیک اس اکنی کی کیا یہی قیمت ہے پولیس کے تھانیدار جی پر جن کا خیال مفلسوں کو کابوس بن کر ڈراتا رہتا ہے، نچھاور کر دے! یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے پوچھا محمد دین، آخر تم نے یہ تکلیف کیوں کی؟''

وہ ٹھوڑی کو باہیں ہاتھ کی انگلیوں میں دباتے ہوئے بولا۔ ''آپ بہت اچھے ہیں تھانیدار جی، آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

دھوواں دھار کمرہ۔۔۔۔ ٹمٹماتی ہوئی لالٹین۔۔۔۔ کھانستا ہوا پشاوری پروپرائٹر۔۔۔۔ اُونگھتے ہوئے قلی۔۔۔۔ گیلا فرش اور شکستہ فرنیچر!۔۔۔۔ سارا منظر میرے سامنے جھولنے لگا۔ میری میز چرچرائی جیسے تعجب کا اظہار کر رہی ہے۔ دائیں طرف دیوار ایک چھپکلی چھرررر کی آواز پیدا کرتی چھت میں گھس گئی۔

محمد دین دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر بولا۔ ''پیجیئے۔''

میں چائے پینے لگا تو وہ بولا۔ ''آپ تو اتنے اچھے ہیں تھانیدار جی، مگر پولیس کا محکمہ اتنا بدنام کیوں ہے؟''

میں بولا۔ ''اصل میں لوگ نہیں سمجھتے۔ ہم مجرموں اور بدمعاشوں کو پکڑنے والے ہیں، چمکارنے پچارنے سے انہیں ہم قابو میں نہیں لا سکتے۔ انہیں یہ کہنا نادانی ہے کہ ''آیئے حضرت تشریف لایئے، تاکہ آنجناب کو حوالات میں بند کر دیا جائے۔ کچھ سخت کلامی کرنی پڑتی ہے، کچھ ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ پولیس والے فرعون اور نمرود کی پستیوں سے بھی نیچے لڑھک گئے ہیں۔ اصل دنیا نہیں سمجھتی۔''

''جی ہاں، دنیاں نہیں سمجھتی۔'' محمد دین سرخ قمیص کی سے ایک پھٹا پرانا رومال نکال کر میرے گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''قطرہ نہ گرے چائے کا۔۔۔۔ آپ کی وردی نہ خراب ہو جائے۔''

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم دن میں کتنا کما لیتے ہو؟''

''میں دن کے وقت بہت تھوڑا کام کرتا ہوں۔ میری ایک بوڑھی ماں اور ایک کنواری بہن ہے۔ دن بھر اس کے پاس پڑا رہتا ہوں اور رات کو گاڑیاں دیکھتا ہوں۔ صرف اس لئے کہ رات کو اسٹیشن پر قلیوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور رات کو مسافر ہمیں مقررہ نرخ سے کچھ زیادہ ہی دے جاتے ہیں۔ ساری رات کام کرتا ہوں، صبح جا کر سو رہتا ہوں۔ اب میری ضعیف ماں اور غمزدہ بہن دعائیں مانگ رہی ہوں گی کہ اللہ کرے میں آج کی ٹھنڈ سے محفوظ رہوں۔ غریب مفت میں اپنی نیند حرام کر رہی ہوں گی۔ انہیں کیا معلوم کہ میں گرم ہوٹل میں بیٹھا تھانیدار جی سے باتیں کر رہا ہوں۔

اس کی آنکھوں میں غرور سا چھلکنے لگا اور میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا گویا وہ میرا بہت ممنوں ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ پر

تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ’’کے گاڑیاں دیکھتے ہوئے رات کو؟‘‘

’’سات آٹھ۔‘‘

’’کتنا کما لیتے ہو؟‘‘

’’آٹھ دس آنے مل جاتے ہیں اکثر۔‘‘

’’جب کسی قُلی کے سامنے کوئی ایسا کمرہ رکتا ہوگا جس میں سے کوئی مسافر نہ اترے تو وہ بہت مایوس ہوتا ہوگا۔ ہے نا؟‘‘

وہ بولا۔ ’’روز کا تجربہ ہے جی۔ کچھ محسوس نہیں کرتا۔ کسی دوسرے قلی بھائی کے بوجھ اٹھانے میں مدد دے دی، چلو طبیعت ہلکی ہوگئی۔ یوں ہم جی ہی جی میں کڑھنے لگیں تو دوسرے ہی دن چارپائی سے لگ جائیں۔۔۔ اور رات کو تو ہمیں کافی آزادی ہوتی ہے۔ دو چار کمرے دیکھ لیتے ہیں اور ہم سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی اچھے پیسے والے کا اسباب اٹھائیں۔‘‘

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ’’لیکن تمہیں مسافروں کے حالات کی کیا خبر؟‘‘

’’روز کا تجربہ ہے نا جی، ہم مسافروں کی چال ڈھال، وضع قطع دیکھنے سے ان کے حالات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ لیکن ایک بار مجھے بڑا دھوکا ہوا۔ ایک سیٹھ جی کا اسباب اٹھایا جن کو میں نے قیافہ کی مدد سے بڑا افراخدل سمجھا۔ اسباب ٹانگے پر آ کر دھرا اور ہاتھ بڑھایا دو پیسے ہتھیلی پر آ گرے۔ میں نے تعجب سے پوچھا ’سیٹھ جی۔ مقرّرہ اُجرت تو ایک آنے ہے اور پھر آپ کے صندوق میں تو جیسے سیسہ بھرا ہوا تھا۔‘‘

مونچھوں پر پانچوں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔ ’’کبھی پیسے کی شکل بھی دیکھی ہے تو نے؟‘‘۔۔۔ اس روز مجھے بہت شرمندگی اٹھانا پڑی۔ اکثر ہمارا قیافہ غلط نہیں نکلتا لیکن کبھی کبھار انسان دھوکا بھی کھا جاتا ہے۔‘‘

بہت دیر تک ہم اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور تاریک ہوٹل کی چھت کے سوراخ میں پھوار کبھی کبھار اندر بھی پڑنے لگتی تھی۔ دور پشاوری پروپرائیٹر مٹی کے کشکول میں چائے پی رہا تھا اور قلی میزوں پر سر رکھے سو رہے تھے۔ کہ اچانک محمد دین کھڑا ہو گیا۔ گاڑی آ رہی ہے شائد۔ میں اسٹیشن جاتا ہوں۔ اجازت ہے؟‘‘

میں نے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ ’’ضرور۔‘‘ اس نے فضل دین اور ہدایت خاں کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور تینوں سرخ قمیصیں دروازہ کھول کر چنگھاڑتے ہوئے طوفان کے ہولناک اندھیرے میں جذب ہوگئیں۔ میں سائیکل کو گھسیٹتا تنگ گلیوں کے غلیظ کیچڑ میں پھسلتا ہوا رات کے دو بجے گھر آن گرا۔

لیکن اس رات مجھے نیند بہت کم آئی۔ میں سوچتا رہا کہ اپنی جوانی کو چٹانوں تلے دبا کر کمانے والے یہ مفلس قلی کیا محبت کرنا جانتے ہیں؟ پیسے پیسے کے لئے دستِ سوال دراز کرنے والے یہ انسان کیا ایسے ہلکے پھلکے جذبات سے عاری نہیں ہوتے؟ کیا یہ سوکھی روٹی اور سرسوں کے ساگ سے پیٹ بھرنے والے، اندھیری کوٹھڑیوں اور متعفّن محلوں میں بسنے والے یہ لوگ انسانیت کے درجے سے گر نہیں جاتے؟

میں تادیر یہ باتیں سوچتا رہا کہ خودداری اور غرورِ نفس سے ان ہڈیوں کے ڈھانچوں کو کیا کچھ سروکار ہوتا ہے؟ کیا یہ ننگے پاؤں اور بے رونق آنکھوں والے مزدوروں کو۔ ۔ ۔ نہ جانے میں اس کیا سوچتا رہا!

دوسرے روزگشت کے دوران ہوٹل کے دروازے پر محمد دین میرا منتظر کھڑا تھا۔ میرا سائیکل اٹھا کر اندر دھر دیا اور میری میز کرسی کو جھاڑنے کے لئے بڑھا۔ آج میری جگہ ایک قلی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بیچارا یوں اچھل کر پرے جا گرا جیسے غلطی سے شیر کے منہ پر بیٹھ گیا ہے۔

آج موسم اچھا تھا اور ہوٹل میں خوب رونق تھی۔ محمد دین اپنی کرسی اٹھا کر میرے قریب لے آیا۔ سب قلی اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک غریب قلی پولیس کے تھانیدار کے اس قدر قریب بیٹھ جائے! یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی!

آج بھی اس نے مجھے چائے پلانا چاہی لیکن میں نے اسے بہت منتوں کے بعد روک دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے محمد دین بولا۔ ''قلی کا پیشہ برا نہیں، تجارت ہے ایک قسم کی۔ اپنی جسمانی قوت دو اور پیسے لو۔ قلیوں کے لئے مہنگا اور مسافروں کے لئے سستا سودا ہے۔ لیکن برا نہیں۔ ہاں ایک بات مجھے بہت کھٹکتی ہے۔ کبھی کبھی اسٹیشن ماسٹر مجھے اپنے گھر بلا لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے میرا داہنا بازو قلم چلاتے چلاتے تھک گیا ہے۔ کمبخت میری پیٹھ کو نہیں دیکھتا، جس پر بوجھ اٹھاتے اٹھاتے نیلی گانٹھیں پڑ گئی ہیں۔ پھر وہ اپنا ننھا بچہ میری گردن پر بٹھا دیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ باغیچے میں کھلاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قمیص اتار کر!''

میں نے پوچھا قمیص اتار کر؟''

''جی ہاں۔ کہتا ہے سرخ قمیص اتار کر میرے بچے کو باغیچے میں لے جایا کروں، ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ اسٹیشن ماسٹر قلیوں کو بیکار میں پکڑ لیتا ہے۔ مفت میں بدنامی ہوگی۔ میں اس کے ضدی بچے کو گھنٹوں اٹھائے اٹھائے پھرتا رہتا ہوں اور جب واپس جاتا ہوں تو گُھر کی بتائی جاتی ہے کہ اتنی جلدی کیوں لوٹ آئے۔ یہ باتیں میرے دل میں کھٹکتی ہیں ورنہ قلی کا پیشہ بُرا نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اجرت ملتی ہے کچھ؟''

''جی ہاں۔''

''کیا؟''

''تیری قمیص چھن لی جائے گی۔ تیرا نمبر ضبط کر لیا جائے گا۔ تجھے قید کروا دوں گا میں۔ تو بازار سے سودا لینے جاتا ہے تو چونی میں سے اکنی ضرور ہضم کر جاتا ہوگا۔ بھوکا کتا، غلیظ چھوکرا۔ ۔ ۔ ۔ یہ اُجرت ملتی ہے مجھے!''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی روز کا تجربہ ہے نا؟''

''جی ہاں! ہے تو روز کا تجربہ لیکن ذرا تلخ سا تجربہ ہے۔ یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ دِل میں ٹیس سی اٹھتی ہے ان باتوں سے۔ ورنہ یوں ہم دو دو تین تین پیسوں پر جان دینے والے جاہل لوگ ایسی باتیں کیوں محسوس کرنے لگے۔ میں ذرا نرم دل سا واقع ہوا ہوں۔ ایسی باتیں مجھے بہت چھبتی ہیں۔ اب کل ہی کی سنئے۔ میں بارش کے طوفان میں ٹھٹھرتا ہوا، گاڑی کے وقت پر پہنچا اور ایک مسافر نے مجھے اشارہ بھی

کیا۔

اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک بابو مجھے بازو سے پکڑ کر دفتر میں لے گیا اور میرے سر پر پھلوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا رکھ کر بولا، میرے کوارٹر میں رکھ آؤ اسے۔۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔۔ ایک منٹ میں۔۔۔۔۔۔ راستے میں پھلوں کو چھیڑنا نہیں۔''

میں اگر انکار کرتا تو میری قمیص اور نمبر ضبط کر لئے جاتے۔ اس مسافر کو ایک اور قلی مل گیا۔ مجھے اس بات سے مسرّت ضرور ہوئی کہ میرے ایک بھائی کا تو صبح کا کھانا بن گیا۔ مگر گھر آ کر ماں بہن کا فاقہ دیکھ کر بہت دیر تک رویا۔ ساری رات نیند نہ آئی۔ جگہ جگہ سے چھت ٹپکنے لگی۔ کھپریل کا چھپرا ایسی موسلا دھار بارش کو خاک روکتا۔ جھک گیا۔ کھسکتے کھسکتے ایک کونے میں آ گئے۔ اِس حالت میں کہ میرا سر ماں کی گود میں تھا۔ اور میرا بازو بہن کے گھٹنوں پر۔ تھانیدار جی، اچانک میری گردن اور میرے بازو پر چار گرم گرم قطرے آن پڑے۔ میں جانتا ہوں وہ بارش کا پانی نہ تھا۔ آنسو تھے۔ پڑوس میں ایک ماسٹر جی رہتے ہیں، خیال آیا کہ ان سے روٹی کا ٹکڑا مانگ لاؤں مگر۔۔۔۔ گاڑی آ رہی ہے، اجازت ہے مجھے؟''

وہ اُٹھا، سرخ قمیص بجلی کی طرح دروازے سے باہر نکل گئی اور اندھیرے کمرے میں پشاوری پروپرائٹر کے سرحدی حُقّے کی گڑ گڑ گڑ اور میرے دل کی دھم دھم دھم سے قطع نظر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

اِس کے بعد چار دن تک مجھے محمد دین نظر نہ آیا۔ قلیوں سے پوچھا مگر انہیں اس کے سوا کچھ خبر نہ تھی کہ وہ اب اسٹیشن پر نہیں آتا۔ شائد منڈی میں مزدوری کر رہا ہے۔

پانچویں دن میں ذرا دیر سے ہوٹل میں پہنچا۔ گاڑی کا وقت قریب تھا اور وہ بے تابی سے ہوٹل کی سڑک پر چل پھر رہا تھا۔ میرے پہنچتے ہی اِس نے جھک کر سلام کیا۔ میرا سائیکل اٹھا کر اندر دیوار سے لگا دیا۔ میری میز کرسی کو جھاڑا اور بولا۔ ''خیریت رہی تھانیدار جی!''

میں نے کہا۔ ''تم سناؤ، اتنے دن کہاں رہے۔''

وہ کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گیا اور سر جھکا کر بولا۔ ''بہن کو نمونیہ ہو گیا تھا۔

''پھر؟'' میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

'آج چل بسی۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں، ہونٹ کانپ گئے۔ حلق گھٹ گیا۔

''بہت افسوس ہوا مجھے۔ مجھے ہمدردی ہے تم سے۔ اس کے دوا دارو کے لئے پیسے کہاں سے لاتے رہے؟''

''کہیں سے نہیں جی۔ مجھے اس کی تیمارداری سے فرصت ہی کہاں تھی کہ اسٹیشن کے چکرّ لگاتا۔ ماں بہت بوڑھی ہے اور بہن بیچاری بہت کمزور تھی۔ فاقوں نے اور نڈھال کر دیا تھا۔ تین دن کراہتی رہی۔ آج ختم ہو گئی۔ ماں الگ بیمار پڑی ہے۔۔۔۔ مجھے کسی سے کچھ مانگتے ہوئے شرم آتی ہے تھانیدار جی۔ عمر بھر اپنا پسینہ بہا کر کماتا رہا اور کھاتا رہا۔ اب بغیر کوئی کام کئے کسی سے کچھ مانگتے شرم آتی ہے۔ میں ذرا نرم دل واقع ہوا ہوں، دل میں ٹیس اٹھتی ہے ان باتوں سے مانگنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ آج اس کے مرنے کے بعد بازار میں مزدوری کرتا رہا۔ اس کے کفن دفن کی کچھ تدبیر کی۔ اب۔۔۔۔''

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''مگر محمد دین دوسروں کو چھوڑو۔ تم نے مجھ سے کیوں نہ مانگا۔''

''مجھے کسی سے مانگتے شرم آتی ہے تھانیدار جی۔۔۔'' وہ رک گیا ذرا وقفے کے بعد پکارا، ''اے خاں جی! چار پیالیوں والی چائے دانی سے جاتا۔''

''کیوں؟ کس لئے؟'' میں نے پوچھا۔

اِس نے اکنی جیب سے نکالی اور پشاوری پروپرائٹر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا ''پیجئے۔ پی لیجئے۔ کیا ہرج ہے تھانیدار جی۔۔۔ گاڑی آرہی ہے۔ شائد، اجازت ہے مجھے؟'' اور وہ بے شمار سرخ قمیصوں کے ریلے میں دروازے سے نکل کر اندھیری رات میں گم ہوگیا۔ میری میز چرچرائی اور دائیں طرف دیوار پر ایک چھپکلی چھرررر کی آواز پیدا کرتی چھت میں گھس گئی۔ میری چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی!

اسّلامُ علیکم

گاؤں میں چٹھی لکھ دیتا تو اسٹیشن پر کوئی ٹٹو، خچر یا گدھا ضرور موجود ہوتا۔ لیکن اوّل تو اسے خط لکھنے کا وقت ہی نہ ملا۔ دوسرے وہ اپنے بیوی اور بچے کو اپنی غیر متوقع آمد سے حیران کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ گاڑی سے اُترا اور ڈوبتے ہوئے سورج کی ترچھی کرنوں سے ڈھکی ہوئی گول گول ڈھیریاں اس نے چاروں طرف بکھری ہوئی دیکھیں تو اس کے کلیجے پر جیسے کسی نے برف سے ٹھنڈی انگلی رکھ دی!

تین سال اس نے فرانس، میسوپوٹیمیا اور مصر میں گزار رہے تھے۔ تین سال وہ مورچوں میں دم گھونٹ دینے والے حبس میں پڑا رہا کیچڑ سے بھری ہوئی خندق میں منہ کے بل لیٹا رہا۔ خاردار جھاڑیوں میں بھوکا پیاسا دبکا رہا۔ جب گولیاں شوکتی ہوئی اس کے سر پر موت کی مہین لکیریں کھینچتی گزر جاتیں اور توپوں کے مہیب گولے مورچوں کے دہانوں پر عین پہلو میں آکر پھٹتے تو وہ دھوئیں اور دھول سے اٹی ہوئی فضا میں اپنی بے رونق آنکھیں جھپکاتا رہ جاتا۔ جب ہوائی جہازوں کی پُر اسرار بھنبھناہٹ سن کر سپاہی زمین سے چمٹ جاتے اور دُھندلی فضا میں سپاہیوں کی ٹانگیں اور باہیں، کھوپڑیاں اور بے ڈھنگے دھڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے نظر آتے تو اِس کی ذہنی نظریں اپنے وطن کی پست قد پہاڑوں پر جم جاتیں اور پھر ان کے درمیان زرخیز وادیوں کے کناروں پر پہاڑوں کے دامنوں میں ننھے ننھے گاؤں۔۔۔ اور ان گاؤں کے بھولے بھولے باشندوں کی دوستیاں اور دشمنیاں۔۔۔ کبڈی کے میلے اور بلوے کی تیاریاں اس کی خوبصورت بیوی اور اس کا بھدا بچہ۔۔۔ یہ سب چیزیں رائی کے مرچیں لگا دینے والے پلستر کی طرح اس کے حافظے پر چمٹ جاتیں اور بندوق میں کارتوس ڈالتے ۔۔۔ دستی بم پھینکتے یا لوہے کے خاردار تاروں پر لکڑی کے تختے یا گلی سڑی لاشیں رکھ کر پھلانگتے ہوئے یہ احساس ہر وقت اس کی ڈھارس بندھائے رکھتا کہ وہ دنیا میں اکیلا نہیں۔۔۔ بے یار و مددگار نہیں۔ اس کا اپنا وطن ہے، اپنا گاؤں ہے، اپنا گھر ہے۔ اس کی اپنی بیوی اور بچہ ہے۔ اس کی زندگی کی دعائیں مانگنے والی اور اس کی موت پر مدتوں تک سوگ منانے والی دو ہستیاں ایک پُر امن اور پُرسکون جھونپڑی میں موجود ہیں۔

محاذ سے لوٹتے وقت جب زخمی کو لاشوں کے انبار کے نیچے کراہتا دیکھتا یا چند دنوں کے مرے ہوئے سپاہی کے پھولے پیٹ اور سوجے اعضاء پر اس کی نظریں پڑتی تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا اور وہ محسوس کرتا جیسے اس نے خود اپنی بگڑی ہوئی لاش پر پاؤں رکھ دیا ہے اور لاش سے کچا بدبو والا غلیظ لعاب رسنے لگا ہے! یہ محسوس کرتے ہی وہ کانپ جاتا جیسے بے شمار بموں کے دھماکے سن کر اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں اور اس کی چکراتی ہوئی کھوپڑی خاک اور خون کے غیر محسوس ذرے بن کر خلاء میں کھو گئی ہے!

امید و بیم کے ان الجھیڑوں سے نکل کر وہ گھر آ رہا تھا، لیکن ایک احساس رہ رہ کر اسے ستاتا تھا۔ اس کی روح کے ایک کچے زخم پر سے بار بار پھاہا اتر جاتا تھا۔ قدم قدم پر وہ واقعہ اس کی نگاہوں کے سامنے تیر جاتا۔ جب اسے فرانس سے ایک گاؤں میں لیوسی ملی

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

تھی۔ لیوسی نے گھر کا پتہ پوچھ لیا۔ اسی رات وہ بارک سے کھسک کر لیوسی سے گھر کے قریب پہنچا۔ وہ کھڑکی میں سے سر نکالتے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس کے پاس آیا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر ماتھے کی آخری لکیر تک سنگ مرمر میں ڈھلی ہوئی حسن و نزاکت کی پتلی لیوسی۔۔۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں مٹکاتی۔۔۔ لمبی لمبی خمیدہ پلکیں جھپکاتی۔۔۔ سنہرے ملائم بال نیلی مہین رگوں کے جال میں پھنسے ہوئے سرخ و سپید گالوں پر بکھیرتی اور مرمریں گردن میں ایک مبہم سا خم ڈالتی اس کی طرف بڑھی اور اپنی گوری گوری بھری بھری باہیں اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیں۔ اپنے لب اس کے لبوں پر کچھ ایسے انداز سے رکھے کہ اس کا دل پسلیوں سے ہمک کر اس کے حلق میں اٹک گیا اور صبح کو اسے لیوسی نے جگا کر کہا۔ ''جاؤ جاؤ دن چڑھ آیا ہے۔ نگل کب کا بج چکا ہے، جاؤ!''

اپنے مختصر قیام کے دوران میں وہ لیوسی کے پاس بلاناغہ آتا رہا اور جب سال کے بعد ہندوستانی فوجیں پھر اسی گاؤں میں واپس آئیں تو لیوسی کی تلاش میں سارے گاؤں اور گاؤں سے باہر چراگاہوں کی خاک چھانتا اور پھرا اور آخر اسے ایک بڑھیا کی زبانی یہ سن کر بے حد افسوس ہوا کہ ''مس لیوسی اپنا تین ماہ کا بچہ لے کر پیرس چلی گئی۔ اور وہاں اتحادی فوجوں کے لئے صابن بنانے والے کارخانے میں کام کرتی ہے۔

لیوسی کا خیال آتے ہی اس کا دل ایک لمحے کے لئے سکڑ جاتا، لیکن یہ خیال کر کے اسے تسلّی ہو جاتی کہ اس راز کو لیوسی اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اور اب وہ تین سال زندگی اور موت کے کڑے امتحانوں سے گزر کر دو مہینے کی چھٹی پر گھر واپس آ رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اسے گزشتہ تین برس کی تنخواہ مل گئی تھی۔ اور چھ سو روپے یکمشت حاصل کر کے اسے یوں محسوس ہوا جیسے انگریزوں نے اپنے سارے خزانوں کی تھیلیاں اس کی جھولی میں الٹ دی ہیں۔

اسٹیشن پر اتر کر اس نے سنتروں اور کیلوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا خریدا۔ ریوڑیوں اور جلیبیوں کی ایک گٹھڑی باندھ لی۔ ایک نیا صندوق خریدا جس پر سبز پھولوں اور سرخ طوطوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ بیوی کے لئے ایک ایسا دوپٹہ خریدا جسے آٹھ بار بھی کسی چیز پر تہہ کر کے رکھا جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے شیشہ پڑا ہے۔ اپنے بچے کے لئے ایک قلم خریدا جس کے دوسرے سرے پر ایک پنسل اور پنسل کی دم میں ربڑ کا ننھا سا ٹکڑا اجڑا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی نے ننھے کو سکول بھیجنا شروع کر دیا ہوگا۔ کیونکہ اسے دیکھ کر وہ اکثر کہا کرتی تھی۔ ''میرا ننھا اچھی شکل کا نہیں ہے تو کیا ہوا۔۔۔ یہ تو مدرسے کا منشی بنے گا اور منشی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔''

بیوی کے لئے سلمے ستارے والی جوتی اور مُنے کے لئے سفید پھندے والی سرخ ٹوپی خریدی۔۔۔ اس نے سوچا کہ تین سال بعد اس کی بیوی اور مُنّا خدا جانے کن کن نعمتوں کے اُمیدوار بیٹھے ہوں گے۔

بستر وہیں اسٹیشن پر اپنے گاؤں کے ایک قلی کے پاس رکھ کر اس نے پھلوں کے ٹوکرے، صندوق اور مٹھائی کی گٹھڑی کو کچھ اس سلیقے سے باندھا کہ سر پر اٹھاتے ہوئے اسے کوئی دقّت پیش نہ آئی۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور تارے آہستہ آہستہ آسمان کی گہری نیلی تہوں کے نیچے سے اُبھر رہے تھے۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں

اس لئے روشنی کی کوئی اُمید نہ تھی اسے اپنے علاقے کی ننھی ننھی پگڈنڈی کے جال اپنے ذہن پر چاند کی کرنوں کی طرح اُبھرتے محسوس ہوئے اور بے فکر چلتا گیا۔ لیکن شائد دہقانوں نے پگڈنڈیوں کے رُخ بدل ڈالے تھے۔ کئی بار وہ کیاریوں میں گھُس گیا جو کنوئیں کے پانی سے لبریز تھیں۔ کئی مرتبہ گہیوں کے بھیگے ہوئے پودوں کو چھو کو اسے اپنی جوانی کے دن یاد آ گئے جب درانتی سے گھاس کے گھٹے اٹھانے میں اول درجہ کا طاقتور نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ گول گول پتھر جب اس کے ٹخنوں سے ٹکرا کر بجتے تو اسے اپنے بچپن کی وہ گھڑیاں یاد آ جاتیں جب وہ گائے اور بکریوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اس کی پنڈلیاں دُکھنے لگتی تھی اور کنکر اُڑ اُڑ کر اس کی ایڑیوں اور ٹخنوں کو زخمی کر دیتے تھے۔ اور جب تھک کر اور کسی پہاڑ کی کھوہ میں سوکھی لکڑی جلا کر وہ ایسے ایسے دوہے گاتا جن کا مطلب خود اسے معلوم نہ ہوتا تھا! ۔۔۔ ان تصورات کے جلو میں لیوسی کا نازک پیکر تیز جھونکے کی طرح آتا اور اسے لمحہ بھر کے لئے جھنجھوڑ کر چلا جاتا۔

جب وہ اپنے گاؤں کے نزدیک پہنچا تو اسے صرف ایک جگہ دھندلی سی روشنی دکھائی دی اور وہ جی ہی جی میں کڑھنے لگا کہ اس کی بیوی کو کس کم بخت نے اطلاع دی کہ وہ جنگ پر سے واپس آ رہا ہے! اس نے بہت بڑی گٹھڑی کو ایک تھکے ماندے شانے سے دوسرے تازہ دم شانے پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ''سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ ساری لذّت ملیا میٹ ہو گئی!'' ۔۔۔ اس کی آدھی خوشیوں پر بچوں کے ان نیلے پیلے غباروں کی سی جھریاں پڑ گئیں جن میں سے تھوڑی سی ہوا نکل گئی ہو۔

جب اس نے اپنے گاؤں کی پہلی گلی میں قدم دھرا تو ایک گول سا پتھر ڈھلان سے لڑھکتا ٹخ ٹخ بجتا کھائی میں گر گیا اور پتھر کا شور سن کر قریب ہی ایک کتا تڑپ کر اٹھا۔ اور اس زور سے بھونکا کہ سوئے ہوئے پہاڑ جاگ اٹھے اور گاؤں کے مشرق و مغرب تک سے ننھے پلوں سے لے کر بڑے بوڑھوں تک سب کتے بلبلا اٹھے تو اس نے سمجھا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہے اور جیسے مکانوں کی منڈیریں اس کی طرف سر ہلا ہلا کر دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں۔ ''ہوں چُھپ چُھپ کر آتے ہو! ۔۔۔ تم سن چودہ کی لام سے واپس آ رہے ہو۔ تمہاری بیوی نے تمہارے لئے سوّیاں پکا رکھی ہیں۔ تمہارا بچہ تمہارا حقہ تازہ کر رہا ہے۔ تمہارے خاندان کی عورتیں چھتوں پر بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ تم ہم سے چھپتے ہو؟ ۔۔۔۔ ہوں؟''

دیواروں سے لگ کر چلتا تیز تیز قدم اٹھاتا جب وہ مسجد کے قریب سے گزرا تو اسے دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ مسجد کا ایک مینار گر گیا ہے اور مولوی جی جو اِس وقت نماز پڑھا رہے تھے، بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ دیئے کی پیلی روشنی ان کی بتیسی بھی جھڑ چکی ہے اور انکی سُریلی آواز پرانی سارنگی کی اس بے ہنگم تان میں تبدیل ہو چکی ہے جو اس کے آخری ڈھیلے ڈھالے تار سے بے خبری میں نکل گئی ہو!۔

مسجد کا دیا دیکھ کر اس کی خوشیاں پھر نئی شان سے ابھریں۔ ان نیلے پیلے غباروں میں پھر کسی نے ہوا بھر دی۔ اس کا گھر مسجد کے قریب ہی تو تھا۔ ایک میل دور سے اگر اسے مسجد کا دھوکا ہوا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ اندھیرے میں نظریں بھٹک ہی جاتی ہیں اور پھر تین سال کا پھیر ہے۔ تین دنوں کا تو نہیں کہ قیاس حرف بحرف سچ نکلے۔

وہ اپنے گھر کے دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر ہی ہو گا کہ ایک شخص اس کے قریب سے ''اسلام علیکم'' کہہ گزر گیا۔ اسے معلوم تھا کہ جواب دینے میں چالیس دنوں کی نماز کا ثواب ہے۔ لیکن وہ صرف اس لئے خاموش رہا کہ اسے اپنے راز کے فاش ہو جانے کا ڈر تھا۔

جس جذبے کو اپنے سینے میں چھپا کر وہ میسو پوٹیمیا سے روانہ ہوا تھا، اسے ذرا سی آواز نکال کر وہ خاک میں کیونکر ملا دیتا۔

اِس نے اپنے مکان کا دروازہ بے حد احتیاط سے کھولا۔ خشک لکڑی کا مَس بجلی کی طرح اِس کے قلب کی طرف دُوڑا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ گٹھڑی سر سے اُتار کر وہ پاگلوں کی طرح دروازے سے لپٹ گیا۔ اِس کا پرانا دوست مدتوں کا خاموش ساتھی۔ جس کی آڑ لے کر اِس نے گاؤں کی ہر لڑکی کو جی بھر دیکھا اور جس کے پیچھے چھپ کر اس نے اپنی بیوی پر چھاچھ کی کُلّی کر دی تھی۔ گٹھڑی ہاتھ میں لٹکا کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور آگے بڑھا۔ مکان کے صحن میں دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں وہ چار پائیوں کے قریب گیا۔ ایک خالی تھی اور دوسری پر اس کا بچہ سو رہا تھا ۔ ایک بار اس نے سارے صحن کا چکر کاٹا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس بیوی کہیں پڑوس میں ہے تو وہ بڑھ کر اپنے بچے کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دھیرے سے بولا۔ ''میرے بچے، میرے بچے!'' وفورمسرت سے اس کا گلا گھٹ گیا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آسمان پر ننھے ننھے تارے جیسے کروٹیں سی بدلنے لگے اور پڑوس میں کوئی بوڑھی بکری اپنی پھٹی پھٹی آواز میں یوں ممیائی جیسے پکار رہی ہے۔ ''امیر خاں۔۔۔۔ ہو امیر خاں!''

مسکرا کر اس نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکالی۔ دیا سلائی روشن کرنے سے پہلے اس کا لڑکا بے شمار صورتیں اختیار کر کے اس کے تصور پر منڈلانے لگا۔۔۔۔ تین سال اور چھ سال کی عمر میں بچے کی شکل وصورت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، سب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے دماغ کی سلوٹوں میں رینگنے لگیں اور جب دِیا سلائی کی رگڑ سے چھرررر کی آواز پیدا ہوئی تو جیسے اِس کے دل کو کسی نے مٹھی میں دبا کر نچوڑ ڈالا۔ تھن تھنا چہرہ۔ موٹے موٹے ہونٹ، لٹکے ہوئے گال، چوڑی ناک، تنگ ماتھا، ذرا سی گردن ۔۔۔۔ ''میرا بچہ!'' ۔۔۔۔ اس نے سرگوشی کی اور جب وہ اسے چومنے کے لئے اتنی بے شمار چیزوں میں سے ایک جگہ کا انتخاب کرنے لگا تو بچے کے دائیں گال پر ناک سے لے کر کان تک ایک سانولی سی لکیر نظر آئی۔ دِیا سلائی بجھ گئی اور اِسے وہ دن یاد آ گیا جب اِس کی بیوی بیمار تھی اور خود چھری لے کر شلغم چھیلنے لگا۔ اس کی بیوی یہ برداشت نہ کر سکی۔ کھاٹ سے اُتر کر چھری اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہی تو پاس ہی منا بیٹھا تھا، اس کے گال پر جا لگی اور خون کی ایک تیز دھار اسکے گلے پر جا لگی اور خون کی ایک تیز دھار اس کے گلے سے ہوتی ہوئی اس کے اُبھرے ہوئے پیٹ، پھولی ہوئی رانوں اور گٹھی ہوئی پنڈلیوں سے گزرتی، ایڑی پر پڑنے لگی تھی۔ اس کی بیوی نے اس سیر سوجی کے حلوے کی منت مانی تھی اور جب ننھا اچھا ہو گیا تو اس نے دس سیر سوجی کا حلوہ پکانے کے لئے نمبردار کے گھر سے دیگچہ منگوایا اور جب فقیر سائیں کی خانقاہ پر جانے کے لئے اس نے میراثن کو بلوایا اور دیگچہ اس کے سر پر دَھرا تو وہ مسخری دو ایک بار لڑکھڑائی اور چلا اٹھی۔ ''ہائیں، مجھ نگوڑی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سوجی کا حلوہ بھی کمر توڑ ڈالتا ہے۔''

اب اِس نے جھک کر اس سانولی لکیر پر اپنے خشک ہونٹ رکھ دیئے اور بچے نے نیند میں انگڑائی لیتے ہوئے اس کے منہ پر ایک ننھا سا طمانچہ لگا دیا۔۔۔۔ قہقہ پر ضبط کرنے کے لئے اس نے اپنا سر گھٹنوں میں گھسیڑ دیا۔ اٹھ کر سرکنڈے کے چھپر تلے آ گیا جہاں گٹھڑی پڑی تھی۔ صندوق کا کنڈا کھول کر مہین دوپٹے، سلمے ستارے والی جوتی، اور سفید پھندے والی ٹوپی کو چھوا۔۔۔۔ پھلوں کا ٹوکرا اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ مٹھائیوں کی گٹھڑی صندوق پر دھر دی۔ روپوں کی پوٹلی پر ایسے ہی ہاتھ پھیرا اور یوں اکڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے وہ نئی دنیا سے ایسی

ایسی چیزیں لے کر آیا ہے، جن کا آج تک گاؤں والوں میں سے کسی نے نام تک نہیں سُنا!

صحن میں نظریں دوڑاتے ہوئے اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اس کا دل غیر معمولی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ اِس کے کان دل کی دھک دھک سننے لگے اور پھر یہ دھمک صحن میں گھومنے لگی۔۔۔ اُوپر فضا میں اُٹھ گئی۔۔۔ کائنات میں پھیل گئی۔۔۔ اندھیرے سے چھن کر ستاروں میں سما گئی۔۔۔ زمین و آسمان اس کے دل کی دھڑکن کی تال پر ناچنے لگے۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھا جیسے اس کا بہت بڑا راز فاش ہونے والا ہے!

اچانک بھنچا ہوا دروازہ چرخ سے کھلا اور اس کی بیوی صحن میں داخل ہوئی۔ اور اس کے دل کی دھک دھک اچانک رُک گئی جیسے گاڑی کا انجن جنگلوں میں اور پہاڑوں میں دندناتا ہوا یکایک تھم گیا ہے۔۔۔! ایک قلابازی کھا کر کوئی چیز اس کی پسلیوں سے ٹکرائی اور وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش میں بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ تپنے لگا! اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے!۔۔۔ رونگٹے اس کے جسم پر چیونٹیوں کی طرح سرسرانے لگے! اس نے اپنی انگلی دانتوں میں بڑے زور سے دبائی۔ مگر اسے کوئی درد محسوس نہ ہوا جیسے وہ لکڑی کو چبا رہا ہے!

اس کی بیوی نے دیوار کے اندر پڑا دیا روشن کیا اور ایک لمحے کے لئے امیر خان کو ایسا محسوس ہوا کہ بیتے ہوئے دن اور تمام گھڑیاں دیئے کی لو میں ٹمٹمانے لگی ہیں۔۔۔ لیوسی کی آنکھوں کی چمک بھی اس لرزتی ہوئی لو میں جھلک رہی تھی!

تین برس!۔۔۔ جن کے خدا جانے کتنے دن ہوتے ہیں، اپنے تمام موسموں سمیت اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان کھڑے ہو گئے۔۔۔ تین برس! اسے معلوم نہ تھا کہ ایک ایک برس اتنی موٹی دیوار چُن سکتا ہے!

امیر خاں نے ان تین برسوں میں اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔۔۔ ہائیں! یہ کیا! امیر خاں کا ہاتھ ایک گٹھڑی کی طرف بڑھا۔۔۔ اس کی بیوی کے انگ پر ریشمی قمیص تھی اور دوپٹہ۔۔۔ دوپٹہ! اس کا ہاتھ اپنی گٹھڑی کی طرف بڑھا!۔۔۔ اس کی بیوی کے مہین دوپٹے میں سے اس کے بالوں کی سیاہی باہر نکل رہی تھی۔ امیر خاں کو وہ دن یاد آ گئے جب وہ بیری کے پتے گھوٹ گھوٹ کر بالوں میں لگایا کرتی تھی اور اس سے کہا کرتی تھی۔ ”میرے بال اتنے لمبے ہو جائیں گے اتنے لمبے ہو جائیں گے کہ بس تم دیکھا ہی کرو گے!“۔۔۔ اور اب امیر خاں ان بالوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیونکہ اس بال واقع بہت لمبے تھے اور جو دوپٹہ وہ اوڑھے ہوئے تھی اس کو آٹھ بار تہ کر کے کسی چیز پر رکھا جاتا تو یوں معلوم جیسے شیشہ پڑا ہے!

چرچراہٹ ہوئی اور امیر خاں کی آنکھیں جو ابھی تک تین برسوں کے اندر برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھیں، اپنی بیوی کے پاؤں پر پڑیں۔۔۔ اِس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف اٹھ گیا۔۔۔ سلمے ستارے کے جوتی اِس کے پاؤں میں تھی اور دیئے کے اِس طرف ایک کھونٹی کے ساتھ سفید پھندے والی سرخ ٹوپی لٹک رہی تھی۔۔۔ وہ آنکھیں میچ کر جھک گیا اور ہاتھ فرش پر ٹیک دیئے۔۔۔ کوئی چیز اس کی انگلیوں سے مس ہوئی۔ یہ سنترے یا کیلے کا ایک چھلکا تھا۔ اس نے وہ سوکھا ہوا چھلکا اٹھا کر یوں پھینک دیا جیسے قصائی گوشت پر سے چھیچھڑا اُتار کر اُڑا دیتا ہے! چھلکا اندھیرے میں مٹی کے کسی برتن سے ٹکرایا۔ آہٹ ہوئی!۔۔۔ اس کی بیوی ایک دم چونکی! امیر خاں

allurdupdfnoyels.blogspot.com

نے جو کہ ابھی چھلکے کی گرفت انگلیوں میں محسوس کر رہا تھا، جیب میں ہاتھ ڈالا اور روپوں کی پوٹلی کو چھوا۔۔۔ اس کی بیوی آہٹ کی جستجو میں بڑھی۔۔۔ سمٹی!۔۔۔ اس کے شیشے ایسے دوپٹے کا ایک کونہ جس میں کچھ بندھا تھا، پھسل کر نیچے گرا۔۔۔ ہلکی سی چھنن کی آواز آئی۔۔۔ امیر خاں نے جیب میں اپنے روپوں کی پوٹلی پر سے اِس وِحشت سے اُنگلیاں اُٹھائیں جیسے اِسے بے شمار سانپوں نے بیک وقت ڈس لیا ہے!

اس کی بیوی نے جھٹ سے دوپٹے کا کونہ اپنے نیفے میں اڑس لیا اور کوٹھڑی کی طرف بڑھی۔ وہ اندھیرے میں ڈوب گئی اور تین برس پھر امیر خاں کی چوڑی چھاتی پر سوار ہو کر ناچنے لگے۔

اس کی نگاہیں اپنے بچے، اس کے چہرے کی سانولی لکیر، کیلے اور سنتروں کے بکھرے ہوئے چھلکوں اور سفید پھندے والی ٹوپی دیکھ رہی تھیں۔ مگر ان چیزوں کا نقش اس کے دماغ پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ برف کے ڈھیلے پر لکیریں کھینچ رہا ہے۔!

جماہی کی اونچی آواز آئی۔ امیر خاں نے کوٹھڑی کے دروازے کی طرف دیکھا اسے معلوم ہوا جیسے دروازہ ابھی تک منہ کھولے جمائی لے رہا ہے۔ اس نے تین برسوں کے شوروغل میں اپنی سماعت پر زور دے کر کچھ سننا چاہا۔۔۔ کچھ۔۔۔ ایک پتلی دبی آواز آئی۔ ''جاؤ، دن چڑھ آیا ہے، مرغ کب کی بانگیں دے چکے۔۔۔ جاؤ۔''

امیر خاں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ امیر خاں کدھر ہے۔۔۔ اور یہ امیر خاں کا گھر ہے یا لیوسی کا مکان اور یہ اس کی بیوی کی آواز ہے یا لیوسی کی۔۔۔ یہ کون ہے اور یہ کسے مخاطب کیا گیا ہے اور۔۔۔ اور وہ سوچ رہا ہے۔۔۔ وہ۔۔۔! کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں!

اندر سے پھر ایک تیز آواز آئی اور اس کے کانوں میں کنکھجورے کی طرح گھس گئی۔ ''اٹھو، میں دیکھ آئی ہوں نمبردار کا دروازہ بند ہے۔۔۔ اب نکلو بھی یہاں سے۔۔۔ نگوڑا پتہ بھی کھڑکے تو میں اُچھل پڑتی ہوں۔۔۔ جاؤ، جاؤ بھی پر یاد رہے کل منُے کے لئے ریوڑیاں اور جلیبیاں ضرور لیتے آنا۔''

امیر خاں نے روپوں کی پوٹلی نکال کر ریوڑیوں کی گٹھڑی پر دھر دی لیکن ایک دم اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ہاتھ کے دباؤ سے ریوڑیاں کڑ کڑ بولنے لگی ہیں!

اس کا دماغ آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی بن گیا۔ دیوار سے چمٹا وہ باہر کھسکنے لگا اور دروازے کی اوٹ میں ہو کر اس نے دیکھا کی کوٹھڑی سے اندھیرے میں ایک بھیگا ہوا آدمی باہر نکلا۔ امیر خاں کے تین برس کے واقعات سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے اس نے انگڑائی لی اور کہا۔ ''لے آؤں گا پہلے کبھی انکار کیا ہے کہ اب اتنی تاکید کر رہی ہو!''

منے کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا اور زیر لب کہنے لگا۔ ''امیر خاں سے اس کی شکل کتنی ملتی جلتی ہے۔''

امیر خاں کی بیوی نے بڑھ کر اپنے بچے کی سانولی لکیر پر اپنے لب رکھ دیئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''امیر خاں سے تیری شکل سچ مُچ کتنی ملتی ہے!'' امیر خاں نے دیئے کی دھندلی روشنی میں اپنی بیوی کے دائیں گال پر پانی کی ایک پتلی سی سانولی لکیر دیکھی۔ وہ وحشیوں کی طرح لپک کر باہر گلی میں آ گیا! گلی کے نکڑ پر اچانک اِس کے جسم پر تھرتھری دوڑ گئی۔ فرانس کے گاؤں کا وہ نکڑ اِسے یاد آ گیا جہاں اِس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں لیوسی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تھا۔

وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ ایک شخص اس کے قریب سے گزرا۔ امیر خاں نے کہا ''اسلام علیکم۔'' جانے والا تیورا کر پیچھے ہٹا اور سلام کا جواب دیئے بغیر نمبردار کے مکان کے سامنے سے دبے پاؤں گزرتا ایک گلی میں غائب ہو گیا۔

سُرخ ٹوپی

اس نے کپڑا نچوڑ کر الگنی پر لٹکایا اور منڈیر پر بیٹھے ہوئے کوّے کو دیکھ کر بولی۔ ''تو جل مرے موئے کالے کلوٹے بھتنے، کائیں کائیں سے میرا مغز چاٹ لیتا ہے۔ گاؤں بھر میں کیا یہی منڈیر اچھی لگتی ہے تجھے؟'' اور اس نے اپنا پرانا جوتا پوری قوت سے منڈیر پر پھینکا۔ کوا کائیں کائیں کرتا پَر پھڑ پھڑاتا اوپر اٹھ گیا اور پھر نمبردار کے بالا خانے کا چکر کاٹ کر اس درے کی طرف اڑ گیا جدھر سے گاؤں کے نوجوان جو فوج اور پولیس میں ملازم تھے، اپنے بڑے بڑے بستر کاندھوں پر دھرے اور ہاتھوں میں جلیبیوں اور پیڑوں کی پوٹلیاں لٹکائے سال سال بھر بعد اپنی ماؤں، بہنوں اور خدا جانے کس کس سے ملنے آتے ہیں۔

ایک اور کوّا اُڑتا ہوا آیا اور منڈیر کی بجائے الگنی پر بیٹھ گیا۔ دو ایک بار جھولا تو دیوار میں دھنسی ہوئی چیڑ کی کمزور لکڑی ڈھیلی ہو گئی، باہر کھسکی اور الگنی کپڑے سمیت زمین پر آ رہی کوّا نمبردار کے بالا خانے کا چکر کاٹ کر اسی درّے کی طرف اڑ گیا۔

اِس نے کوّے کی بارہ پشتوں کو ایسے ایسے خطاب دیئے کہ پڑوسنیں چھتوں پر چڑھ آئیں۔ ادھیڑ عمر کی ایک بنی ٹھنی بیوہ ناک پر انگلی رکھ کر بولی۔ '' ہے ہے کیا غضب ہو گیا کیا قیامت ٹوٹ پڑی۔ کوّے نے الگنی گرا دی؟ قربان جاؤں، میں سمجھی بہو رانی کو بچھو نے کاٹ لیا۔ اے یہ کوؤں کی کائیں کائیں بہت اچھا شگون ہے۔ یاد رکھو، تیرا سپاہی آج کل آیا کہ آیا۔''

''اسے چھٹی نہیں ملنے کی۔ وہ ابھی رنگروٹ ہے!'' اس نے گرد آلود کپڑے کو صابن کے میلے جھاگ میں بھگوتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا دل پکار رہا تھا، ''پگلی رنگروٹوں کو بھی چھٹی مل سکتی ہے اور وہ تو اب رنگروٹی پاس کر چکا ہوگا۔'' اور جب اس نے اس درّے کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک ایک کوّا نظر آیا جس کے سر پر ہاتھ بھر لمبا طرہ تھا اور جس کی پگڑی کا رنگ گہرا نارنجی تھا۔ جس کی مونچھیں بچھو کے تنے ہوئے ڈنگ کی طرح سرخ گالوں پر کنڈلی مارے بیٹھی تھیں اور جس کے کپڑوں سے شوں شاں کی آوازیں آتی تھیں۔ جس کے ہاتھ میں گلابی ریشم کا ایک بہت رومال تھا۔ اور کانوں میں عطر کی پھریریاں۔ درّے کی ہوا اس کے وجود سے عطر کی لپٹیں اڑاتی اس کے گھر پر منڈلانے لگی۔ اچانک ایک کوا ''سائیں'' سے اس کے صحن پر سے تیر کی طرح گزر گیا اور اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر، کپڑے کو دونوں ہاتھوں سے نچوڑتے اور مروڑتے ہوئے کہا۔ ''غارت ہو جائے ان موئے کوّوں کی نسل۔ دُھلا دُھلایا کپڑا غارت کر ڈالا۔ موئے ضدی، بخیل!''

اِن مختصر میٹھے خوابوں میں بسنے والی مہری اِس گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ کوئی دس مہینے ہوئے اس کی شادی ہوئی تھی۔ گاموں کو اس نے شادی کے بعد پہلی مرتبہ دیکھا۔ پندرہ بیس دن اکھٹے گزارے۔ کھل کر بات کی نوبت ہی نہ آئی۔ ہر بات میں جھینپ اور ہر حرکت میں حجاب وہ پانی مانگتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے یونہی بیٹھے بیٹھے کسی گیت کا ایک بول گنگنا دیا! اور وہ بات کرتا تو جیسے شہد کی مکھی کسی مرتبان میں بھنبھنا رہی

ہے! اور جس روز ان کے گاؤں میں بڑا صاحب آیا اور گاموں کے اُبھرے ہوئے پٹھوں، چوڑے چکلے سینے اور گٹھے ہوئے جسم کو دیکھ کر بولا۔ ''دل تم لوگ اچا جوان ہے۔'' تو اس روز مہری اپنی اچھی اچھی سہیلیوں سے بھی نہ بولی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان چھوکریوں سے بہت بلند ہے جن کے گھر والے تو شہروں میں مزدوریاں کرتے ہیں یا کھیتوں میں دن بھر ہل چلاتے ہیں اور رات گئے گھر آ کر سوکھی روٹیاں نگل کر اور کھاٹوں پر دراز ہو کر ایسے ایسے، وحشت ناک خراٹے بھرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہوائی جہازوں کا ایک غول گڑگڑاتا جا رہا ہے!

اس روز گاموں کی گردن بھی کچھ اکڑ سی گئی اور چوپال پر سرحدی حقے پر لپٹے ہوئے میلے چیتھڑوں کو چھو کر بولا۔ ''بھئی شرم آتی ہے۔ ایسا غلیظ حقہ پیتے ہوئے۔'' اور چوپال والوں نے اسے یہ اعتراض کرنے میں حق بجانب سمجھا۔ کیونکہ گوری جلد والے صاحب نے اس کی جسمانی صحت کو بہت سراہا تھا اور پھر اس نے گاموں سے جس گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا اس سے سب لوگ واقف تھے۔ حتیٰ کہ وہ لڑکیاں بھی واقف تھیں جو چھتوں پر، منڈیروں کی آڑ لئے صاحب بہادر کو گھورتی تھیں!

مہری کو جہیز میں ایک ریشمی کپڑا نہ ملا تھا اور اس کے ماتھے کی مہر اور کانوں کے آویزے جو تانبے کے تھے، شادی کے دوسرے ہی دن اپنی چمک کھو بیٹھے تھے۔ لیکن جب گاموں فوج میں ملازم ہو گیا تو مہری کو پڑوسن کی سونے مہر اور جھمکے دیکھ کر کوئی خلش نہ ہوئی اور اس نے کئی بار محسوس کیا جیسے اس کے گلے میں کسی دیسی چھینٹ کا چولا نہیں بد دیشی ریشم کی قمیص ہے جو صابن کے جھاگ کی طرح مہین اور اس کی سانولی جلد کی طرح نرم ہے!

شادی کے پندرھویں روز جب گاموں اپنے بیاہ کے رنگین بکس سے کپڑے نکال رہا تھا اور مہری اس کے لئے ایک ایسی توشک کے انتخاب میں مصروف تھی جسے چھو کر اس کے سپاہی بھائیوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں تو چھت پر ادھیڑ عمر کی بیوہ پڑوسن نمودار ہوئی۔ آج اس نے سرخ ریشم کی قمیص پہن رکھی تھی جس کے حاشئے پر سبز ململ ٹکی ہوئی تھی اور اس کے کانوں میں سونے کے جھمکوں کے سروں پر دو ننھے موتی بھی جھم جھم ناچ رہے تھے جیسے اُوس کے قطرے پھولوں پر پڑے کانپ رہے ہوں۔ مہری اسے دیکھ کر پل بھر کے لئے جل اٹھی مگر دراز قدموں کی چوڑی پیٹھ اور تیزی سے حرکت کرتے ہوئے بازو دیکھے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کچے گھر کے صحن میں نئے بادشاہ کے چمکتے دمکتے روپوں کی چھن چھن بارش ہو رہی ہے!

دن ڈھلے گاموں گاؤں سے باہر نکلا، تو اس کے پیچھے نوجوانوں کا ایک انبوہ تھا۔ بوڑھا نائی گاموں کا بہت بڑا بستر اٹھائے قدم قدم پر نتھنوں میں نسوار چڑھاتا سب کے پیچھے رینگتا جا رہا تھا اور جب سب نوجوان گاؤں سے ایک میل دور درے سے گزر کر ایک طرف مڑ گئے تو پڑوسنیں گردنیں بڑھا بڑھا کر چلائیں۔ ''ہے ہے بہورانی کیا ٹک ٹک گھور رہی ہے اپنے دولہا کو، کیا چوپٹ زمانہ آیا ہے! ہم نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب دولہا مر رہا تھا اور دلہن لجائی ہوئی کونے میں سمٹی بیٹھی تھی اور یہ دن بھی دیکھا کہ دُلہن چھت پر بیٹھی اپنے دُولہا کو یوں گھور رہی ہے جیسے یہ کوئی طوطا تھا کہ پنجرے سے نکل کر اڑ گیا اور پھر واپس نہ آئے گا!''

اور مہری کاندھے جھٹکاتی اٹھی۔ تیوری چڑھا کر، آنچل کو سینے پر پھیلایا اور سیڑھیوں سے اترتے ہوئے بولی۔ ''خالہ بی۔ میں اسے

نہ دیکھوں تو کسے دیکھوں، میں دوسری لڑکیوں کی طرح گلیوں میں پھرتے ہوئے آوارہ لونڈوں کو تو تانکنے جھانکنے سے رہی!''

اور بیوہ پڑوسن اپنی دونوں جوان بیٹیوں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کیا منہ پھٹ ہے!'' اور دونوں نوجوان بیٹیاں ہاتھ نچا نچا کر کہنے لگیں۔ ''آٹھ دس دن اکیلی رہی تو سب نشے ہرن ہو جائیں گے۔'' پڑوسنیں ہنس دیں اور مہری نے نیچے اُتر کر گاموں کے پرانت جوتے اور چپل جھٹک کر ایک پھٹی پرانی بوری میں رکھ دیئے۔ تمباکو کا برتن ایک چنگیز سے ڈھانپ کر اوپر ایک بکس دھر دیا اور حقے کا پانی انڈیل کر اسے ایک کونے میں اٹکا دیا۔ کھاٹ باہر نکال کر بیٹھ گئی۔ جب شام ہوئی اور قریب ہی مسجد سے بوڑھے مولوی جی نے سریلی آواز میں اذان دی تو غیر ارادی طور پر اس کی نظریں دروازے پر جم گئیں۔ جہاں گاموں نماز کے بعد نمودار ہوتا تھا اور کھانا کھا کر کہتا تھا۔ ذرا چوپال پر ہو آؤں؟'' ۔۔۔ ''ہو آؤ'' وہ جواب دیتی اور پھر اندھیری رات کی چپ چاپ میں واپس آ کر مہری کے پاس بیٹھ جاتا اور کہتا ۔۔۔ ''پانی پلا دینا ذرا۔''

اور وہ ایلومینیم کا کٹورا اٹھا کر اس میں پانی ڈالتے ہوئے کہتی۔ ''کہو تو شکر ڈال دوں۔''

یہ سن کر گاموں کا رنگ سرخ ہو جاتا۔ اس کی رگوں میں تھرتھراہٹ دوڑ جاتی اور گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیتا۔ ''ڈال دے۔''

کچی دیوار میں چھت کے قریب لوہے کی ایک زنگ آلود میخ سے سرخ رنگ کی ایک ٹوپی لٹکی رہتی تھی جس پر سفید کھدر کا بنا ہوا چاند ستارے کا نشان بھی تھا۔ ایک روز مہری نے گاموں سے پوچھ ہی لیا کہ ''یہ ٹوپی کس کی ہے؟ کون پہنتا ہے؟ یہاں کیوں لٹک رہی ہے؟'' اور گاموں نے جواب دیا۔ ''یہ ایک بہت اچھے زمانے کی یاد دلاتی ہے مجھے۔ کچھ سال گزرے ہمارے ملک پر ایک بہت اچھا وقت آیا تھا ہندو، مسلمان اور سکھ سب آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اکٹھے بیٹھتے تھے کئی بار اکٹھے کھانا بھی کھا لیتے تھے۔ میں ان دنوں بچہ ہی تھا۔ لیکن ابا مجھے بتایا کرتے تھے کہ اس زمانے کو خلافت کا زمانہ کہتے ہیں۔ ابا قصبے سے گتا خرید لائے اور اس پر سرخ کھدر چڑھا کر، سفید کھدر سے کٹا ہوا چاند ستارا ٹانک کر یہ ٹوپی بنائی اور میرے سر پر رکھ دی۔ ابا اور گاؤں کے دوسرے بزرگ لمبے لمبے جھنڈے ۔۔۔ کاندھوں پر رکھے گلیوں کے چکر کاٹتے اور ہم بچے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ان کے پیچھے پیچھے چلتے اور گایا کرتے تھے

انت الھادی انت الحق
لیس الھادی الاھو۔۔۔''

اور جب مہری نے گاموں سے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے تو وہ نہایت باوقار آواز میں بولتا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہ کرو۔ سچ بولو، نمازیں پڑھا کرو اور بڑھوں کا ادب کرو۔''

مہری پر گاموں کی علمیت کا بھی بہت زیادہ رعب پڑ گیا تھا۔ گاموں نے اسے بتایا تھا کہ ''ابا کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور چھ مہینے وہ جیل میں چکی پیستے رہے۔ واپس آئے تو بیمار تھے۔ چارپائی سے لگ گئے۔ آخر چل بسے۔ اگر ہمارے نمبردار جی سے ان کی دشمنی نہ ہوتی تو انہیں کون قید کرتا۔ وہ تو بس ''انت الھادی انت الحق۔'' زور زور سے گایا کرتے تھے۔ سرکار کے خلاف انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ یہ سرخ ٹوپی ان دنوں کی نشانی ہے۔ پڑی رہے۔ کبھی کام آئے گی۔''

اور گاموں کے چلے جانے کے بعد جب کبھی مہری کی نظریں اِس ٹوپی پر پڑتیں، تو وہ آنکھیں جھپکا جھپکا اور کلائیوں میں کنگن گھما گھما کر سوچا کرتی کہ کس کام آئے گی۔ یہ ٹوپی؟ کون پہنے گا اسے؟ اور سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچتی کہ گاموں نے جو بے مطلب ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالتا، یہ بہت بے مطلب بات کہی۔

آٹھ دس مہینے گزر گئے اور اس نے سن رکھا تھا کہ سال کے بعد سپاہیوں کو چھٹی ملتی ہے۔ پچھلے چند دنوں سے ایک کوّا بلا ناغہ اس کے مکان کی منڈیر پر بیٹھ کر اس زور سے چیختا رہتا کہ اس کی دُم ہر کائیں کے ساتھ جھک کر زمین کو چھو لیتی تھی اور ننھے بچے چونک کر بلبلا اٹھتے۔ پڑوسنیں جی ہی جی میں کڑھتیں کہ کوے کا مکان کی منڈیر پر بیٹھنا، ان کے نزدیک بہت اچھا شگون تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کی مہری اچھے دن دیکھے۔ کیونکہ وہ ذرا منہ پھٹ تھی اور بات کرتے وقت یہ نہیں سوچتی تھی کہ اس کی مخاطب کے بدن پر ریشمی قمیص ہے اور کانوں میں سنہری جھمکے!

ان آٹھ دس مہینوں میں گاموں کی دو چٹھیاں بھی آئیں جن میں اس نے لکھا کہ ’’ہم دن بھر دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ ہماری چھاؤنیاں بہت بڑے بڑے شہر ہیں جہاں کی صفائی مسجدوں کے صحنوں کی سی ہے۔ ہمیں صبح کو دال اور شام کو گوشت ملتا ہے۔ یہاں میرا ایک دوست ہے۔ جس کے وطن میں لنگیاں بہت اچھی بُنی جاتی ہیں۔ میں تمہارے لئے ایک لُنگی ضرور لاؤں گا۔ افسر لوگ عام طور پر شہر نہیں جانے دیتے۔ عید کے روز ہمیں چھٹی تھی۔ میں شہر گیا تو ایک دکان پر ایسے ایسے خوبصورت جھمکے دیکھے کہ تم لو تو الف لیلیٰ کی لال پری لگنے لگو۔ یہاں کپڑا سستا ملتا ہے اور تمہاری ریشمی قمیص صرف ڈیڑھ روپے میں بن سکتی ہے میں تمہارے لئے چار قمیصیں لے آؤں گا اور تم اُداس نہ رہا کرو۔ نمازیں پڑھا کرو۔ قرآن شریف پڑھ سکتی ہو تو صبح کو ضرور پڑھا کرو۔ اس سے برکت ہوتی ہے۔ یہاں مجھے ایک خوبصورت قرآن پاک ملا ہے جس کی جلد چمڑے کی ہے اور جس کے صفحوں کے اِردگرد بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ مکان کی لپائی کی ضرورت ہو کرا لینا۔ رقم میں آ کر ادا کر دوں گا اور باقی سب خیریت ہے۔‘‘

اس قسم کی دو چٹھیاں مہری کو پہنچیں اور گو وہ قرآن پاک کے سوا اور کچھ نہ پڑھ سکتی تھی، لیکن گاؤں کے مولوی جی نے جو بیک وقت مدرسے کے اول مدرس مسجد کے امام اور برانچ پوسٹ ماسٹر تھے، اسے جو کچھ پڑھ کر سُنایا، اس نے اپنے دماغ میں محفوظ کر لیا۔ اس نے کسی کے آگے ان چٹھیوں کی بات تک نہ کی۔ لیکن عام لوگوں کی زبان سے اس نے اپنے پردیسی سپاہی کے خط کے الفاظ سنے تو اسے مولوی جی پر بہت غصہ آیا اور یہ سن کر تو اس کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی کہ نمبردار جی کل چوپال پر بیٹھے کہہ رہے تھے کہ گاموں بڑا بدمعاش ہے۔ ریشمی قمیصوں اور سنہرے جھمکوں کی باتیں بدمعاش ہی خطوں میں لکھا کرتے ہیں۔ اور گو مہری نمبردار کی ان باتوں کا مطلب نہ سمجھی، لیکن وہ ساری رات جاگتی رہی اور صبح اٹھ کر کپڑے دھونے بیٹھی تو کوّے نے اسے اِس قدر تنگ کیا کہ اس پر اپنا پرانا جوتا پھینکنے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑی۔

بھلا ہو بوڑھی نائن کا وہ ہر ہفتے مہری کے ہاں جاتی اور اسے لون مرچ تیل اور صابن گاؤں کی دکانوں سے خرید کر دے جاتی اور پچھلے چند دنوں سے تو بلا ناغہ مہری کے پاس آنے جانے لگی تھی۔ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہتی اور کہتی۔ ’’اتنی بڑی بڑی چیزیں نہ اٹھایا کر بیٹی۔ یہ اچھا نہیں ہوتا۔‘‘

اور پھر ایک ہفتے کے بعد مہری کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ چاند سا چہرہ دیکھ کر اسے اپنا گاموں یاد آ گیا جو چھاؤنی کے بڑے بڑے کمروں میں دنیا کے اتنے بڑے واقعہ سے بے خبر گھومتا پھر رہا ہوگا۔ اس نے نائن کو چار پیسے دے کر گاموں کے نام ایک چٹھی لکھوائی کہ ننھے کا کیا نام رکھا جائے۔!

جب نائن اس کے پاس بیٹھی ایک سیپی میں ننھے کے لئے دوا تیار کر رہی تھی تو مہری کی نظر سرخ ٹوپی پر جا پڑی۔ جس پر سفید کھدر سے کٹا ہوا چاند ستارا چمک رہا تھا۔ اور پھر اس کے پہلو میں ننھا رونے لگا اور اچانک اسے ٹوپی کا مصرف معلوم ہو گیا۔

وہ جی ہی جی میں بہت خوش ہوئی اور سوچتی رہی۔ ’’مہرا گاموں تو کوئی بے مطلب بات نہیں کرتا۔ میرے گاموں کی نظریں کتنی دور پہنچتی ہیں!‘‘

اسی شام کو جب اس پر نیند کی مستی چھا رہی تھی اور نائن دیوار سے لگ کر اونگھ رہی تھی تو دروازہ کھلا اور گاموں ہانپتا اندر آیا۔ کاندھے سے بستر اُتار کر زمین پر پٹخ دیا اور مہری کی طرف دیکھ کر بولا۔ ’’کیا بات ہے، بیمار تو نہیں ہو مہری؟‘‘

مہری چونک پڑی۔ اس کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ وہ اس شدت سے لرزی کہ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا ننھا سوتے میں بلبلا اٹھا۔ گاموں سب کچھ سمجھ گیا اور مسکرایا لیکن یہ مسکراہٹ بہت بے رونقی سی تھی!

بوڑھی نائن نے اُٹھ کر گاموں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے کاندھے کو اپنے ’’نسوار آلود‘‘ ہونٹوں سے بوسہ دیا۔ کڑوے تیل کا دیا طاقچے میں دم بخود پڑا تھا اور سارے کمرے میں زود زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بڑھیا بولی۔ ’’میرے لال تجھے لاکھ لاکھ مبارکیں یوں بھی کوئی نوکری سے آتا ہے۔ نہ گز بھر لمبا طرہ۔ نہ ریشمی قمیص، نہ گلابی لنگی جیسے چوری چھپے کھسکتا ہوا گلیوں میں ادھر آ نکلا۔ آخر یہ بھی کیا آنا ہوا۔‘‘ اور گاموں نے اپنا بستر کھول کر بڑھیا کو ایک کپڑا نکال دیا اور کہا ’’لے خالہ یہ تیری نذر۔‘‘ اور جب وہ بستر کو لپیٹ رہا تھا تو مہری نے ایک طرف سونے کے جھمکے، ریشمی قمیص اور رنگ دار لنگیاں پڑی دیکھیں۔

بوڑھی نائن گاموں کو دعائیں دیتی گھنٹہ بھر کے لئے گھر چلی گئی۔ گاموں مہری کے قریب گیا اور جھک کر بولا۔ ’’مہری!‘‘ مہری کانپ اٹھی! اور اپنے کمزور ہاتھ بلند کر کے اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے بولی۔ ’’کتنے مہینوں کی چھٹی ملی ہے؟‘‘

گاموں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مدھم آواز میں بولا۔ ’’میرا نام کٹ گیا!‘‘

باہر کوئی بھولا بھٹکا کوا ان کے مکان کی چھت پر سے کائیں کائیں کرتا گزر گیا! مہری کے پہلو میں سویا ہوا ننھا بچہ سوتے میں اچانک کانپ کر رہ گیا۔ مہری پھٹی پھٹی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی بولی۔ ’’کس لئے؟‘‘

وہ بولا۔ ’’میں پکا ہونے والا تھا اس لئے میرے افسروں نے میرے چال چلن کے بارے میں نمبردار سے پوچھ بھیجا تھا۔ نمبردار نے لکھ دیا کہ یہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کا والد ’’انت الہادی انت الحق‘‘ پڑھا کرتا تھا اور اس کے گھر میں ابھی تک سرخ رنگ کی ٹوپی لٹک رہی ہے۔ جس پر چاند ستارے کا نشان ہے۔۔۔۔ افسروں نے مجھے برخاست کر دیا ہے!‘‘

مہری اسی طرح لیٹی رہی۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی جب گاموں نے جھمکے نکال کر اس کے سینے پر رکھ دیئے تو اس نے انہیں

چھوا تک بھی نہیں۔ بولی۔ ”آج کل سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ جھمکے بک جائیں تو کتنے دن بے فکری میں گزریں گے؟ اور شائد یہ سلی سلائی قمیصیں بھی کوئی خرید لے!“

گاموں بھونچکا سارہ گیا۔ دیوار پر دوڑتی ہوئی ایک چھپکلی سرخ ٹوپی سے ٹکرائی اور ٹوپی گرد و غبار کا ایک مرغولہ اڑاتی گاموں کے قدموں میں آن گری! اور باہر اندھیرے میں کوئی بھولا بھٹکا کوا کائیں کائیں کرتا نمبردار کے بالاخانے سے ٹکرا کر پھڑ پھڑایا اور جانے کدھر اڑ گیا۔